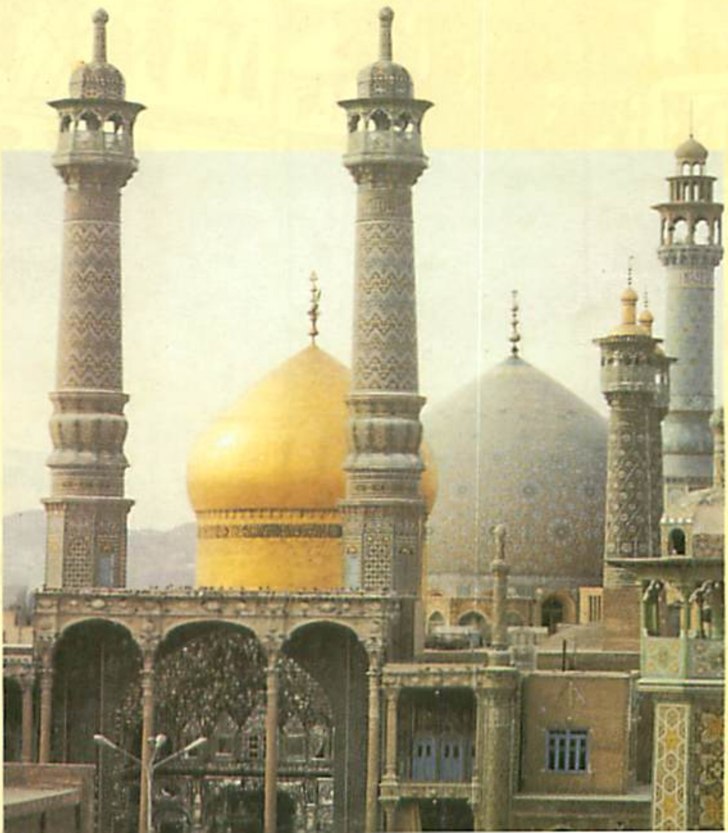
الرسالہ

Al-Risāla

March 2001 • No. 292 • Rs. 10

دنیا کی زندگی ایک شاک ٹریٹمنٹ ہے۔ کامیاب وہ ہے جو
اس شاک ٹریٹمنٹ سے اپنے لئے مفید سبق حاصل کر سکے۔



عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر، مولانا وحید الدین خاں کے قلم سے

تذکیر القرآن (مکمل)	400.00	اسلام: ایک عظیم جدوجہد	5.00	دین انسانیت	60.00
مطالعہ سیرت	60.00	تاریخ دعوت حق	5.00	فکر اسلامی	50.00
اسباق تاریخ	85.00	مطالعہ سیرت (کتابچہ)	12.00	شتم رسول کا مسئلہ	50.00
تعمیر حیات	60.00	ڈائری (جلد اول)	80.00	طلاق اسلام میں	5.00
تعمیر انسانیت	50.00	کتاب زندگی	65.00	مضامین اسلام	60.00
سفرنامہ (غیر ملکی اسفار، جلد اول)	85.00	اقوال حکمت	25.00	حیات طیبہ	7.00
سفرنامہ غیر ملکی اسفار، جلد دوم	125.00	تعمیر کی طرف	8.00	باغ جنت	7.00
اسلام: ایک تعارف	80.00	تبلیغی تحریک	20.00	نار جہنم	7.00
اللہ اکبر	60.00	تجدید دین	25.00	سچا راستہ	8.00
پیغمبر انقلاب	50.00	عقلیات اسلام	35.00	دینی تعلیم	7.00
مذہب اور جدید چیلنج	65.00	قرآن کا مطلوب انسان	8.00	خلیج ڈائری	10.00
عظمت قرآن	35.00	دین کیا ہے؟	7.00	رہنمائے حیات	7.00
عظمت اسلام	60.00	اسلام دین فطرت	7.00	تعدد ازواج	7.00
عظمت صحابہ	7.00	تعمیر ملت	7.00	ہندستانی مسلمان	60.00
دین کامل	80.00	تاریخ کا سبق	7.00	روشن مستقبل	7.00
الاسلام	45.00	فسادات کا مسئلہ	5.00	صوم رمضان	7.00
ظہور اسلام	50.00	انسان اپنے آپ کو پہچان	5.00	اسلام کا تعارف	5.00
اسلامی زندگی	40.00	تعارف اسلام	5.00	علما اور دور جدید	10.00
احیاء اسلام	35.00	اسلام پندرہویں صدی میں	5.00	سفرنامہ اسپین و فلسطین	60.00
راز حیات	65.00	راہیں بند نہیں	12.00	مارکسزم: تاریخ جس کو رد کرچکی ہے	12.00
صراط مستقیم	40.00	ایمانی طاقت	7.00	سوشلزم ایک غیر اسلامی نظریہ	10.00
خاتون اسلام	60.00	اتحاد ملت	7.00	یکساں سول کوڈ	5.00
سوشلزم اور اسلام	50.00	سبق آموز واقعات	7.00	اسلام کیا ہے؟	8.00
اسلام اور عصر حاضر	30.00	زلزلۂ قیامت	10.00	میوات کا سفر	35.00
الربانیۃ	40.00	حقیقت کی تلاش	12.00	قیادت نامہ	35.00
کاروان ملت	45.00	پیغمبر اسلام	5.00	منزل کی طرف	5.00
حقیقت حج	30.00	آخری سفر	7.00	اسفار ہند	125.00
اسلامی تعلیمات	35.00	اسلامی دعوت	7.00	ڈائری ۹۰-۱۹۸۹	100.00
اسلام دور جدید کا خالق	25.00	حل یہاں ہے	10.00	قال اللہ و قال الرسول	70.00
حدیث رسول	40.00	امہات المومنین	20.00	ڈائری ۹۲-۱۹۹۱	0.00
راہ عمل	25.00	تصویر ملت	85.00	مطالعہ قرآن	30.00
تعبیر کی غلطی	80.00	دعوت اسلام	50.00	مذہب اور سائنس	40.00
دین کی سیاسی تعبیر	20.00	دعوت حق	40.00		
عظمت مومن	7.00	نشری تقریریں	80.00		

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الرسالہ، مارچ، 2001

خصوصی شمارہ: ایک ہفتہ بہار میں



الرسالہ
Al-Risāla

اردو، اور انگریزی میں شائع ہونے والا
اسلامی مرکز کا ترجمان

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خاں
صدر اسلامی مرکز

Al-Risāla
1, Nizamuddin West Market,
New Delhi-110013
Tel. 4625454, 4611128
Fax 4697333, 4647980
e-mail: skhan@ vsnl.com
website: www.alrisala.org

SUBSCRIPTION RATES
Single copy Rs. 10
One year Rs. 110. Two years Rs. 200
Three years Rs. 300. Five years Rs. 480
Abroad: One year $ 10/£6 (Air mail)

DISTRIBUTED IN ENGLAND BY
IPCI: ISLAMIC VISION
481, Coventry Road, Birmingham B10 0JS
Tel. 0121-773 0137, Fax: 0121-766 8577
e-mail: info@ipci-iv.co.uk

DISTRIBUTED IN USA BY
AL-RISALA FORUM INTERNATIONAL
1439 Ocean Ave., 4C Brooklyn
New York NY 11230 Tel./Fax 718-2583435
e-mail: kaleem@alrisala.org

Printed and published by Saniyasnain Khan on behalf of The Islamic Centre, New Delhi.
Printed at Nice Printing Press, 7/10, Parwana Road, Khureji Khas, Delhi- 110 051

ایک ہفتہ بہار میں

مدرسہ صدیقیہ (سرسیا) کی دعوت پر بہار کا سفر ہوا۔ مدرسہ صدیقیہ مولانا عبد الرحیم امدادی نے اپنے مرشد، قاری صدیق باندوی (وفات ۱۹۹۷) کے نام پر قائم کیا ہے۔ ۳۱ اکتوبر ۲۰۰۰ کی شام کو دہلی سے راجدھانی اکسپریس کے ذریعہ روانگی ہوئی، اور ۸ نومبر ۲۰۰۰ کی صبح کو دوبارہ راجدھانی اکسپریس کے ذریعہ دہلی واپس آیا۔ یہ سفر ایک ہفتہ تک جاری رہا۔ اس سفر کی روداد مختصر طور پر یہاں درج کی جاتی ہے۔

۳۱ اکتوبر ۲۰۰۰ کی شام کو میرے سفر کا آغاز ہوا۔ دہلی سے پٹنہ جانے والی راجدھانی اکسپریس اپنے ٹھیک وقت پر نئی دہلی ریلوے اسٹیشن سے روانہ ہوئی اور ٹھیک وقت پر پٹنہ پہنچی۔ درمیان میں اس ٹرین کا مقرر اسٹاپ صرف دو جگہ تھا۔ کانپور اور مغل سرائے۔ مگر ٹرین کو درمیان میں کئی جگہ غیر مقرر طور پر رکنا پڑا اور کئی جگہ اس کی رفتار بھی کسی وجہ سے سست ہوگئی۔ اس سے میں نے یہ سمجھا کہ وہ پٹنہ پہنچنے تک ضرور لیٹ ہوجائے گی۔

چنانچہ درمیان میں ہماری کوچ کا ریلوے کارکن ایک رجسٹر لے کر آیا جس میں مسافروں کو اپنا تاثر درج کرنا ہوتا ہے۔ میں نے اپنا تاثر ان الفاظ میں لکھ دیا:

Service, Food, everything was good except late running of the train

مگر جب پٹنہ پہنچ کر وہاں کے ریلوے اسٹیشن پر اترا تو معلوم ہوا کہ ٹرین اپنے ٹھیک وقت پر یہاں پہنچی ہے۔ اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ ٹرین نے راستہ میں makeup کیا اور آخر کار اس نے اپنے سفر کو وقت پر پورا کرلیا — زندگی میں ایسا ہوتا ہے کہ آدمی درمیان میں پچھڑ جاتا ہے لیکن ہوش میں آنے کے بعد اگر وہ اپنی رفتار کو تیز تر کردے تو آخر کار وہ اپنے وقت پر منزل تک پہنچ جائے گا۔

سفر کے دوران میرے کیبن میں ایک صاحب تھے جن کا نام مسٹر جے سنگھ پریہار تھا۔ وہ راجپوت خاندان میں پیدا ہوئے اور انجینئر نگ کی تعلیم حاصل کی۔ آج کل وہ گجرات میں سروس کر رہے ہیں۔ ان سے میں نے کہا کہ راجپوت لوگ پہلے ہندستان کا رولنگ کلاس سمجھے جاتے تھے۔ اب ملک میں ان کا یہ رول ختم ہوگیا ہے۔ ایسا کیوں ہے؟ انہوں نے کہا کہ راجپوت لوگ اپنی ماضی کی بڑائی کے احساس میں رہے، وہ نئی تعلیم میں آگے نہ بڑھ سکے۔

چنانچہ جب تک تلوار کا دور تھا وہ اپنے بازو کی طاقت سے حکومت کرتے رہے۔ مگر اب بُدّھی کا زمانہ ہے تعلیم میں پیچھے ہونے کی وجہ سے وہ بڑھی میں پیچھے ہوگئے۔ یہی ان کے سیاسی چھڑے پن کا اصل کارن ہے۔

مسٹر پر یہار نے گفتگو کے دوران کہا کہ میری پتنی روزانہ اشنان کر کے پوجا کرتی ہے، میں نہ پوجا کرتا ہوں اور نہ مندر جاتا ہوں۔ مگر ہم دونوں میں کوئی ٹکراؤ نہیں۔ انہوں نے کہا کہ یہی ڈیموکریسی ہندو دھرم کی خاص صفت ہے۔ مسٹر پر یہار نے کئی اور باتیں ہندو دھرم کے بارے میں کہیں۔ مثلاً انہوں نے کہا کہ میرا خیال یہ ہے کہ ہندوؤں کو اپنے دیوتا پر یقین نہیں۔ اس لئے وہ بہت سے دیوتاؤں کو مانتے ہیں۔ تا کہ ایک سے کام نہ بنے تو دوسرے کو پکاریں۔ اور دوسرے سے کام نہ بنے تو تیسرے کو پکاریں۔

اسلام کے بارے میں انہوں نے ابھی تک کچھ پڑھا نہیں تھا۔ میں نے انہیں چند باتیں بتانے کی کوشش کی مگر میرا خیال یہ ہے کہ جب تک آدمی تیار ذہن (prepared mind) نہ ہو، وہ باتوں کو اچھی طرح سمجھ نہیں پاتا۔ دعوت کا کام ہمیشہ مسلسل کوشش کا طالب ہوتا ہے۔

ٹرین میں اخبارات مطالعہ کے لئے دیئے گئے۔ ہندی روزنامہ آج، جو کانپور سے نکلتا ہے، اس کو دیکھا۔ ادارتی صفحہ پر ایک خط چھپا ہوا تھا جس کے لکھنے والے مسٹر راجو دویدی (ہر جیند رنگر، کانپور) تھے۔ اس خط کا عنوان تھا، دیش کی رکھشا میں مسلمان کسی سے پیچھے نہیں۔ مکتوب نگار نے لکھا تھا کہ ہمارے مسلمان بھائی راشٹر رکھشا ہتو جان و مال کی بازی لگانے میں کسی انیہ بھارتی سے پیچھے نہیں۔

میں جب اس قسم کی کوئی بات سنتا یا پڑھتا ہوں تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی شخص کسی بچے کی ماں سے کہے کہ یہ ماں اپنے بیٹے سے پیار کرنے میں کسی دوسری ماں سے کم نہیں۔ اس قسم کی بات مجھے بڑی عجیب معلوم ہوتی ہے۔ اس لئے کہ وطن سے لگاؤ ایک فطری چیز ہے۔ وہ ہر انسان کو یکساں طور پر ہوتا ہے، خواہ اس کا مذہب کچھ بھی ہو۔

درمیان میں مغل سرائے کا اسٹیشن آیا۔ یہاں مجھے ایک واقعہ یاد آیا جس کا تعلق ۱۹۴۷ سے پہلے والے دور سے ہے۔ دو انگریز مسافر مغل سرائے اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر آگے پیچھے چل رہے تھے۔ پیچھے والے انگریز کے ہاتھ میں ایک ٹرنک (بکس) تھا۔ اس نے تیزی سے آگے بڑھنا چاہا۔ اس کوشش میں اس کا ٹرنک آگے والے انگریز سے ٹکرا گیا۔ وہ پلیٹ فارم پر منہ کے بل گر پڑا۔ یہ ایک نہایت سخت واقعہ تھا مگر اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ صرف یہ تھا کہ پیچھے والے انگریز نے کہا ساری (sorry) اور آگے والے انگریز نے اٹھتے ہوئے کہا اوکے (okay)۔ ان دو لفظوں کے بعد بات ختم ہو گئی اور دونوں اپنی اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گئے۔

آزادی کے بعد ہندستان میں جو بگاڑ آیا، اس کو عام طور پر انگریزوں کا ورثہ کہا جاتا ہے۔ مگر یہ سراسر

غلط ہے۔ آج کے ہندستان میں اگر انگریزوں کی وراثت جاری رہتی تو یہاں مذکورہ قسم کے واقعات دکھائی دیتے جب کہ عملاً یہاں اس کے بالکل برعکس ہو رہا ہے۔

بہار کے سفر کے لئے مجھے ۳۱ اکتوبر ۲۰۰۰ کی شام کو روانہ ہونا تھا۔ ایک ہفتہ کے اس سفر کا پورا پروگرام بہار کے لوگوں نے بنالیا تھا۔ مگر سفر سے صرف ایک دن پہلے ۳۰ اکتوبر کو مجھے زکام ہوا اور اسی کے ساتھ حرارت آگئی۔ ٹمپریچر ۱۰۰ ڈگری تک پہنچ گیا۔ میں سخت پریشان تھا کہ ایسی حالت میں یہ لمبا سفر کس طرح کروں گا۔ میرے ساتھی مجھ کو سفر سے منع کرنے لگے۔

آخر کار بے بسی کے احساس کے ساتھ میں نے اللہ سے یہ دعا کی کہ خدایا، تیرے کچھ منتظر بندوں کا دل توڑنے سے بچنے کے لئے میں یہ سفر کر رہا ہوں، تو بھی میرے دل کو ٹوٹنے سے بچالے۔ میری بیماری کو اچھا کردے۔ اور میرے حق میں اس رحمت کا فیصلہ فرمادے جو حضرت ابراہیم کی زبان سے قرآن میں اس طرح بیان ہوئی ہے: واذا مرضت فهو يشفين (الشعراء ۸۰)

اس کے بعد ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ میں بادل ناخواستہ ٹرین میں سوار ہو گیا۔ اور پھر وہاں عشاء کی نماز پڑھنے کے بعد سو گیا۔ فجر سے پہلے نیند کھلی تو اندر کی بنیان پسینہ میں بالکل بھیگی ہوئی تھی۔ اس طرح پسینہ نکلنا میرے لئے علاج بن گیا۔ چنانچہ جب میں یکم نومبر ۲۰۰۰ کی صبح کو پٹنہ ریلوے اسٹیشن پر اترا تو میری طبیعت ٹھیک ہو چکی تھی اور میرا بخار اتر گیا تھا۔ اس کے بعد سفر کے آخر تک میری طبیعت بالکل ٹھیک رہی۔ دعا ایک طاقت ہے، بلکہ وہ سب سے بڑی طاقت ہے۔

بہار کا ابتدائی تعارف مجھے تقریباً ۶۵ سال پہلے اس وقت ہوا جب کہ میں یوپی کے ایک عربی مدرسہ کا طالب علم تھا۔ ایک بار بہار کے ایک نوجوان اس مدرسہ میں داخلہ کے لئے آئے۔ مجھے یاد ہے کہ جب وہ دار الاقامہ میں پہنچے تو وہاں کے طلبہ نے سنجیدہ انداز میں کہا: کیا آپ کے شامل بدھنا بھی ہے۔ یہ بظاہر ایک سنجیدہ سوال تھا۔ مگر وہ بہار کے طالب علم کی تضحیک تھی۔

بہار کے طلبہ لوٹے کو بدھنا کہتے تھے اور ساتھ کی جگہ شامل بولتے تھے۔ یہ زبان یوپی والوں سے مختلف تھی۔ اور یوپی والے چونکہ اپنی زبان کو معیاری سمجھتے ہیں اس لئے وہ اس قسم کے فرق پر بہار والوں کا مذاق اڑاتے تھے۔

یہ معاملہ صرف نوجوان طلبہ تک محدود نہ تھا۔ اساتذہ کا رویہ بھی اس معاملہ میں زیادہ مختلف نہ تھا۔ مجھے یاد ہے کہ ایک بار ہماری کلاس میں عربی کا ایک لفظ، غالباً 'دقیق' سامنے آیا۔ ہمارے استاد نے اس کا مطلب پوچھا۔ بہار کے ایک طالب علم نے اس کو بتاتے ہوئے کہا باریک۔ استاد نے یہ سن کر کہا کہ آپ

نے تواس کواور موٹا کر دیا۔ بہار کے لوگ چونکہ اکثر 'ر' کو 'ڑ' کی طرح بولتے ہیں، اس لئے یہ لطیفہ پیش آیا۔

یوپی اور دہلی کے لوگ بہار والوں کی زبان اور ان کی تہذیب کو لمبی مدت سے اپنے سے کم سمجھتے رہے ہیں۔ چنانچہ "بہاری" کا لفظ وسط ہند کی زبان میں کم تر کے معنی میں معروف ہو گیا۔ مگر اب صورت حال بالکل بدل گئی ہے۔ یوپی اور دلی کے مسلمانوں کا فخر پسندی کا مزاج ان کے لئے الٹا ثابت ہوا۔ اس مخصوص ذہن کی بنا پر ان کے اندر محنت اور ایڈ جسٹمنٹ کا مزاج پرورش نہ پاسکا۔ چنانچہ وہ جدید ترقیاتی میدان میں زیادہ آگے نہ بڑھ سکے۔ اس کے برعکس بہار کے لوگوں کے حالات نے ان کے اندر تواضع (modesty) اور کمی کا مزاج پیدا کیا۔ اپنے اس مزاج کی بنا پر وہ زیادہ محنت کرنے لگے۔ اسی کا نتیجہ یہ ہے کہ آج بہار کے مسلمان تقریباً ہر میدان میں یوپی اور دلی کے مسلمانوں سے آگے ہیں، ملک کے اندر بھی اور ملک کے باہر بھی۔

بہار کے سفر کا پروگرام بنا تو وہاں سے ایک صاحب کا خط موصول ہوا۔ یہ خط ان کے الفاظ میں یہ تھا:

"مغربی چمپارن میں آپ کے دورہ کا پروگرام سن کر بہت خوشی ہوئی۔ لیکن اس بات کا بہت دکھ ہوا کہ آپ کے پروگرام میں علاقہ دیوراج رام نگر شامل نہیں۔ علاقہ دیوراج رام نگر مغربی چمپارن کا دل ہے۔ اگر یہ علاقہ محروم رہ گیا تو یہ پروگرام میرے خیال سے ادھورا رہ جائے گا۔ اگر ممکن ہو تو رام نگر یا بگہی میں سے کسی ایک کو ضرور منتخب کریں گے۔ انشاء اللہ ضیافت میں کوئی کمی نہیں ہوگی (شمس الہدیٰ خاں۔ رام نگر، مغربی چمپارن)

اس خط میں "ضیافت" کا لفظ میرے لئے بڑا عجیب تھا۔ ممکن ہے مکتوب نگار کے ذہن میں ضیافت کا کوئی دوسرا مفہوم ہو۔ مگر ہمارے علاقہ میں عام طور پر ضیافت کا لفظ کھانے پینے کے معاملہ میں بولا جاتا ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے رہنماؤں نے جو نمونہ پیش کیا ہے وہ یہی ہے کہ ان کے سفروں میں اگر کھانے پینے کا اعلیٰ اہتمام ہو تو وہ خوش ہوتے ہیں۔ اور اگر اس کا اعلیٰ اہتمام نہ ہو تو وہ ناخوش ہو جاتے ہیں۔ اور اس کو اپنی بے عزتی کے ہم معنی سمجھتے ہیں۔ مگر میرا معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ جو لوگ مجھ کو قریب سے جانتے ہیں ان کو معلوم ہے کہ مجھے پر تکلف کھانے کے بجائے معمولی کھانا پسند ہے۔ پر راحت زندگی کے بجائے سادہ زندگی میں میری روح کو خوشی ملتی ہے۔ شہرت اور عزت کے مقام پر بیٹھنے سے زیادہ لذیذ میرے لئے یہ بات ہے کہ میں اپنے آپ کو گم نامی میں پاؤں اور اپنی تنہائیوں میں اللہ کو یاد کروں۔

یکم نومبر کی صبح کو جب میں پٹنہ کے ریلوے اسٹیشن پر اترا تو وہاں اسٹیشن کی طرف سے پبلک ایڈریس سسٹم پر مسلسل اعلان ہو رہا تھا: ایک ہندو مسافر جو میرے ساتھ ہی ٹرین سے اترے تھے انہوں نے اس کو سن کر کہا کہ اس کو سنئے یہ اعلان آپ کے لیے ہو رہا ہے۔ ریلوے اناؤنسر کہہ رہا تھا۔ مولانا وحید الدین پدم بھوشن

پر سکارت کا بہار کی پاون دھرتی پر ہارد ک سواگت ہے۔ ایک صاحب نے بتایا کہ ریلوے کی طرف سے کیا جانے والا یہ اعلان چھ بار دہرایا گیا۔

ریلوے اسٹیشن پر بہار کے مختلف علاقوں کے لوگ بڑی تعداد میں موجود تھے۔ ان کے ساتھ روانہ ہو کر ہم لوگ جناب ایم ٹی خان کی رہائش گاہ (عدالت گنج) پہنچے۔ یہاں تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ قیام رہا۔ تعلیم یافتہ لوگ کافی تعداد میں اکٹھا ہو گئے۔ ان سے مختلف موضوعات پر باتیں ہوتی رہیں۔ اس مجلس میں کئی تعلیم یافتہ خواتین بھی موجود تھیں۔ اس نسبت سے میں نے کہا کہ عورتوں کی تعلیم بے حد ضروری ہے۔ عورتوں کو تعلیم یافتہ بنائے بغیر مسلم معاشرہ ترقی یافتہ معاشرہ نہیں بن سکتا۔ تاہم تعلیم سے میری مراد وہ تعلیم نہیں ہے جو فیشن سکھائے، بلکہ وہ تعلیم ہے جو حقیقی معنوں میں باشعور بنائے۔

پٹنہ میں انگریزی اخبار ٹائمس آف انڈیا کی خاتون نمائندہ سنجیدہ بانو نے اپنے اخبار کے لئے تفصیلی انٹرویو ریکارڈ کیا۔ ان کا ایک سوال یہ تھا کہ آپ بھی ایک عالم ہیں، مگر روایتی علماء اور آپ کے درمیان فرق ہے ایسا کیوں، میں نے کہا کہ میں کوئی موڈرن عالم نہیں۔ میں بھی پورے معنوں میں ایک روایتی عالم ہوں۔ جہاں تک اسلام اور قرآن وحدیث کا تعلق ہے میرے اور ان کے درمیان عقیدہ و عمل کا کوئی اختلاف نہیں۔ اس اعتبار سے دونوں کا دین مکمل طور پر ایک ہے۔ میرے اور ان کے درمیان جو فرق ہے وہ نظریہ کا نہیں بلکہ طریق کار کا ہے۔

میرا معاملہ یہ ہے کہ میں نے مدرسہ میں عربی اور دینی تعلیم کی تکمیل کے بعد ذاتی محنت سے انگریزی پڑھی اور جدید علوم کا تفصیلی مطالعہ کیا۔ اس سے میں نے سمجھا کہ اسلام کی ابدی صداقت کو جدید اسلوب میں پیش کرنے کی ضرورت ہے تاکہ وہ آج کے انسان کے لئے زیادہ قابل فہم ہو سکے۔ اس ایک بات کے سوا دونوں کے درمیان کوئی اور فرق نہیں۔

مشہور فلم اسٹار شتروگھن سنہا پٹنہ میں پیدا ہوئے۔ ۱۸ اکتوبر ۲۰۰۰ کو آل انڈیا ریڈیو پر میں ان کا ایک انٹرویو سن رہا تھا۔ انہوں نے ایک سوال کے جواب میں کہا کہ میں ملک کے اندر اور ملک کے باہر ہر جگہ جاتا ہوں۔ مگر آج بھی مجھے پٹنہ ہی سب سے زیادہ پسند ہے۔ گفتگو کے دوران انہوں نے جو باتیں کہیں ان میں سے ایک یہ تھی کہ کلاکار کو چاہئے کہ وہ ہر دن اپنے آپ کو ری انونٹ (re-invent) کرے۔ آپ کا آج آپ کے کل سے اچھا ہونا چاہئے۔ ہر دن آپ کو پچھلے دن سے اچھا کام کرنا چاہئے۔

یہ بات ہر ایک کے لیے درست ہے۔ آدمی کے فطری امکانات اتنے زیادہ ہیں کہ بے شمار استعمال کے بعد بھی وہ ختم نہ ہوں۔ ایک ایسی زندگی گزارنے کے لئے جس میں ہر دن وہ اپنے آپ کو از سر نو دریافت

کرے۔ اس کی واحد شرط یہ ہے کہ وہ ہمیشہ اپنے آپ کو کم محسوس کرے۔ وہ کبھی اس احساس کا شکار نہ ہو کہ میں نے اپنے کام کو جیسا کرنا چاہئے تھا ویسا کر دیا۔ اس پہلو سے عدم قناعت (discontent) کسی آدمی کا سب سے بڑا سرمایہ ہے اور قناعت (content) اس کی سب سے بڑی بے مائگی۔

ایک مغربی مفکر کا قول ہے کہ علم میں ترقی کے لئے سب سے زیادہ ضروری چیز تواضع (modesty) ہے۔ تواضع کے بغیر کوئی شخص علم کے اعلیٰ مرتبہ تک نہیں پہنچ سکتا۔ آدمی کے اندر اگر کبر کی نفسیات ہو تو اس کے اندر دوسروں سے سیکھنے کا مزاج نہ ہوگا۔ اس کی بے اعترافی اس میں رکاوٹ بن جائے گی کہ وہ اپنے سوا کسی اور کو صاحب علم مانے اور اس سے استفادہ کر کے اپنے علم کو بڑھائے۔ اس کے برعکس جس آدمی کے اندر تواضع کی نفسیات ہو وہ ہر لمحہ اس کے لئے تیار رہے گا کہ جو چیز بھی کسی سے ملے اس کو وہ فوراً شکریہ کے ساتھ قبول کرلے اور اس طرح اپنے علم کو مسلسل بڑھاتا رہے۔ تواضع کا مزاج کسی آدمی کے لئے علم کے دروازہ کو کھولتا ہے اور کبر کا مزاج اس کے لئے علم کے دروازہ کو بند کر دیتا ہے۔

پٹنہ میں یکم نومبر کی صبح کو جناب محمد محی الدین صاحب سے ملاقات ہوئی۔ وہ پٹنہ یونیورسٹی میں پروفیسر اور وائس چانسلر رہ چکے ہیں۔ انہوں نے میری تحریروں کے بارے میں اپنے تاثر کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ مجھے آپ کے خیالات سے پورا اتفاق ہے۔ ہندستان میں اسی طرح کام کرنے کی ضرورت ہے، کنفرنٹیشن کی پالیسی اس ملک میں مفید نہیں ہوسکتی۔

میں نے کہا کہ میں کنفرنٹیشن کی پالیسی کو تباہ کن حد تک غلط سمجھتا ہوں، مگر اس پالیسی کی اہمیت صرف ہندستان کے اعتبار سے نہیں ہے بلکہ قانون فطرت کے اعتبار سے ہے۔ آپ خواہ ہندستان میں ہوں یا یورپ وامریکہ میں، ہر جگہ آپ کی کامیابی کا راز صرف یہ ہے کہ کنفرنٹیشن کی پالیسی سے بچ کر تعمیری انداز اختیار کریں۔ حتی کہ خالص مسلم ملکوں میں بھی کنفرنٹیشن کی پالیسی کے ساتھ آپ کامیاب نہیں ہوسکتے۔

ٹائمس آف انڈیا کا پٹنہ ایڈیشن (یکم نومبر ۲۰۰۰) دیکھا اس میں صفحہ دس پر مختلف لوگوں کے اقوال درج تھے سب سے پہلا قول حضرت علی بن ابی طالب کا تھا۔ اس قول کو انگریزی زبان میں اس طرح نقل کیا گیا تھا:

> It is right that the king should govern himself before governing his subjects.

یعنی بادشاہ کو اپنی رعایا پر حکم چلانے سے پہلے خود اپنے آپ پر حکم چلانا چاہئے۔

میں سمجھتا ہوں کہ صالح حکمراں کی یہ بہترین تعریف ہے۔ عادل حکمراں اور غیر عادل حکمراں کے

درمیان یہ فرق ہے کہ عادل حکمراں دوسروں کو جس چیز کا حکم دیتا ہے اس پر پہلے وہ خود عمل کر چکا ہوتا ہے۔ اس کے برعکس غیر عادل حکمراں دوسروں کے نام تو بڑے بڑے حکم جاری کرتا ہے مگر خود اپنی ذات کو اس سے مستثنیٰ کر لیتا ہے۔

ایک اور قول برطانیہ کے مشہور قانون داں لارڈ ایکٹن کا تھا۔ اس کے الفاظ یہ تھے کہ اصل خطرہ یہ ہے کہ کوئی متعین طبقہ حکمرانی کے لئے غیر موزوں نہیں، بلکہ ہر طبقہ حکمرانی کے لئے غیر موزوں ہے:

The danger is not that a particular class is unfit to govern. Every class is unfit to govern.

میں سمجھتا ہوں کہ لارڈ ایکٹن کے اس قول کی تشریح خود انہی کے ایک اور قول سے ہوتی ہے انہوں نے کہا: اقتدار بگاڑتا ہے (power corrupts)۔ لوگ اکثر اس حکمراں طبقہ کو برا کہنے لگتے ہیں جو بالفعل حکومت کر رہا ہو۔ وہ سمجھتے ہیں کہ سیاسی برائی اسی مخصوص طبقہ میں ہے۔ مگر ایسا نہیں۔ سیاسی برائی خود اقتدار کے عہدہ میں ہے، جو بھی سیاسی اقتدار کی کرسی پر بیٹھے گا وہ کم یا زیادہ بگاڑ کا شکار ہوگا۔ اس لئے قابل عمل بات یہ ہے کہ لوگ اس معاملہ میں زیادہ حساس نہ ہوں۔ اس لئے کہ ایک حکمراں کو ہٹا کر دوسرا جو حکمراں آپ لائیں گے، عین ممکن ہے کہ وہ اس سے بھی زیادہ بگڑا ہوا ہو۔

اس معاملہ کی ایک مثال بہار کے مشہور لیڈر جے پرکاش نارائن کی زندگی میں پائی جاتی ہے۔ انہوں نے کانگریس کی حکومت میں کچھ خرابیاں دیکھیں۔ اس کے بعد انہوں نے یہ رائے قائم کر لی کہ ہندستان کی تمام برائیوں کی جڑ کانگریس پارٹی کی حکومت ہے۔ اگر کانگریس کو سیاسی اقتدار سے ہٹا دیا جائے تو ملک میں سمپورن کرانتی (ٹوٹل ریولیوشن) آجائے گا۔ چنانچہ انہوں نے زبردست سیاسی اکھیڑ پچھاڑ کے بعد کانگریس کو مکمل طور پر اقتدار سے ہٹا دیا۔ مگر اس کے بعد دوسری حکومت جو جنتا پارٹی کے زیر اقتدار بنی وہ کانگریس سے بھی زیادہ نااہل ثابت ہوئی۔ خود جنتا پارٹی کے اندر اقتدار کی اتنی رسہ کشی ہوئی کہ مقرر مدت پوری کرنے سے پہلے ہی وہ ٹوٹ کر ختم ہو گئی۔ اس لیے سیاسی معاملات میں صحیح طریقہ یہ ہے کہ حکمراں کے بگاڑ پر صبر و تحمل کا طریقہ اختیار کرتے ہوئے ممکن دائرے میں اصلاح کی کوشش کی جائے۔

پٹنہ ایک تاریخی شہر ہے۔ یہاں کی قابل دید چیزوں میں سے ایک خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری ہے۔ یہ اپنی خصوصیات کی بنا پر عالمی شہرت کی مالک ہے۔ اس لائبریری کے بانی خدا بخش خاں تھے۔ انہوں نے اپنے والد محمد بخش کی وصیت کے مطابق یہ لائبریری قائم کی تھی۔

یہ لائبریری ۲۹ اکتوبر ۱۸۹۱ کو قائم کی گئی۔ اس لائبریری کی غیر معمولی اہمیت کے پیش نظر پارلیمنٹ

کے ایک ایکٹ کے تحت دسمبر ۱۹۶۹ میں اس کو قومی اہمیت کا ادارہ بنادیا گیا۔ اس وقت خدابخش لائبریری میں بیس ہزار ایک سو ایک عربی۔ فارسی۔ اور اردو مخطوطات اور ُدو لاکھ کے قریب نایاب اور جدید مطبوعات موجود ہیں۔

لائبریری زندگی کا حصہ ہے۔ ہر بستی میں لائبریری کا وجود ضروری ہے۔ حتی کہ ہر گھر کے اندر چھوٹی یا بڑی لائبریری ضرور موجود رہنا چاہئے۔ کھانا اگر جسمانی خوراک ہے تو لائبریری گویا دماغی خوراک۔

پٹنہ میں جناب ایس ایم ہاشم صاحب سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے ایک چھپا ہوا رسالہ مجھ کو دیا جس کا خلاصہ یہ تھا کہ اسلام ایک مکمل نظام حیات ہے۔ اسلام کے پاس زندگی کے ہر مسئلہ کا حل موجود ہے ضرورت ہے کہ اسلام کو ایک مکمل نظام حیات کی حیثیت سے نافذ کیا جائے۔

یہ بظاہر خوبصورت نظریہ صرف ایک بے اصل نظریہ ہے۔ وہ دین کے غلط تصور پر قائم ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اسلام کا تعلق انسان کی پوری زندگی سے ہے مگر یہ تعلق اس معنی میں ہے کہ ایک فرد جب اسلام کے عقیدہ کو دل سے اپنا عقیدہ بناتا ہے تو اس کے بعد اس کے ہر قول اور ہر عمل میں اس کا اظہار ہوتا ہے۔ اسی طرح اگر ایک پورا معاشرہ اسلام کے عقیدہ کو گہرائی کے ساتھ اختیار کرے تو اس کا اثر معاشرہ کی تمام سرگرمیوں میں ظاہر ہونے لگے گا۔

پٹنہ میں جن لوگوں سے ملاقات ہوئی ان میں سے ایک جناب محتشم علی خان (Tel.: 0612-687955, 0612-221531) تھے۔ وہ الرسالہ مشن سے اتفاق رکھتے ہیں۔ وہ پیشہ کی مصروفیت کے باوجود الرسالہ کا مطالعہ پابندی سے کرتے ہیں۔ میرا اندازہ ہے کہ تعلیم یافتہ مسلمانوں کی بیشتر تعداد الرسالہ کے نقطۂ نظر سے متفق ہو چکی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ کچھ لوگ زبان سے اپنے اس اتفاق کا اظہار کرتے ہیں اور کچھ لوگ اپنے دل سے۔

میں نے سوچا کہ جن لوگوں کا دل یہ گواہی دیتا ہے کہ الرسالہ کا مشن ایک درست مشن ہے وہ زبان سے اس کا اظہار کیوں نہیں کرتے۔ میری سمجھ میں آیا کہ وہ شعوری یا غیر شعوری طور پر یہ محسوس کرتے ہیں کہ زبان سے اس کا اعلان کرنا بالواسطہ طور پر اپنی غلطی کا اعتراف کرنا ہے۔ اور غلطی کا اعتراف بلاشبہ ہر آدمی کے لئے سب سے زیادہ مشکل کام ہے۔

یکم نومبر کی صبح کو پٹنہ سے ڈھاکہ کے لئے روانگی ہوئی۔ اس سفر میں کئی لوگ میرے ساتھ تھے۔ برادرم محمد ثناءاللہ ندوی (۲۶ سال) بھی میرے ساتھ تھے۔ انہوں نے ۱۹۹۵ میں ندوہ سے فراغت کی ہے۔ انہوں نے بتایا کہ آپ کی سب سے پہلی کتاب جو میں نے پڑھی وہ الاسلام یتحدیٰ (مذہب اور جدید چیلنج)

ہے۔اس کے بعد میں برابر آپ کی تحریریں پڑھتا رہا ہوں۔انہوں نے اپنے قلم سے یہ الفاظ لکھے۔"میں نے حضرت کی کتابوں سے جہاد کا صحیح تصور، دعوت کا حقیقی نہج، سنت رسول کا صحیح نمونہ، زندگی کا اصل مقصد، جینے کا حوصلہ، حق کی تلاش کا سچا جذبہ اور خدمت دین کی روحانی قوت کا سبق لیا ہے اور اب الحمد للہ مولانا کی کتابوں سے اور ان کے مشن دعوت حق سے مکمل اتفاق رکھتا ہوں"۔ برادرم ثناء اللہ ندوی بہار کے اس پورے سفر میں میرے ساتھ رہے، میں نے انہی کے ذریعہ یہ سفر نامہ لکھوایا۔

یکم نومبر کو پٹنہ سے ڈھاکہ جاتے ہوئے درمیان میں ہم لوگ مظفر پور سے گذرے۔ یہاں تھوڑی دیر کے لئے قیام کیا گیا۔ مظفر پور بہار کا ایک شہر ہے جو کپڑے وغیرہ کی مارکیٹ کے لئے مشہور ہے۔

مظفر پور میں ایک قدیم مدرسہ ہے۔ یہاں عربی اور دینی تعلیم کا انتظام ہے۔ مولانا عبد الرحیم امدادی نے کہا کہ ان کے شیخ حضرت قاری محمد صدیق باندوی نے سلّم کی تعلیم اسی مدرسہ میں حاصل کی تھی۔

سلّم قدیم منطق کے موضوع پر ایک کتاب ہے۔ اس کا پورا نام سلّم العلوم ہے۔اس کے مصنف بہار کے ایک عالم قاضی محب اللہ بہاری (وفات ۱۱۱۹ھ) ہیں۔ وہ اورنگ زیب عالمگیر کے ہم عصر تھے۔ قدیم زمانہ میں منطق کی اس کتاب کی اتنی زیادہ اہمیت ہوئی کہ اورنگ زیب نے قاضی محب اللہ بہاری کو اپنے بیٹوں کی تعلیم کے لئے مقرر کیا۔ مگر اب اس کتاب کی اہمیت زیادہ تر تاریخی ہے۔ عصری منطق کے اعتبار سے اس کی زیادہ اہمیت نہیں۔

سلّم العلوم کی شرحیں کثرت سے لکھی گئی ہیں۔ "شرح نویسی" کا یہ طریقہ میرے نزدیک صرف تقلیدی ذہن کی پیداوار ہے۔ صحیح یہ ہے کہ لکھنے والے لوگ خود اپنی تحقیق سے نئی کتابیں لکھیں۔ شرح نویسی کے اس طریقہ کا نقصان یہ ہوا کہ بعد کے زمانہ میں ذہنی ارتقاء کا عمل رک گیا۔ لوگوں نے قدیم متون کو مقدس سمجھ لیا۔ اس کے بعد انسانی ذہن کا کام صرف اس کی شرح لکھنا رہ گیا نہ کہ خود کوئی نیا اور تخلیقی کام پیش کرنا۔

مظفر پور ریلوے اسٹیشن کے پاس ایک قدیم مسجد ہے۔ انیسویں صدی کے آخر میں جب یہاں ریلوے لائن بچھائی جانے لگی تو مسجد اس کے راستہ میں پڑ رہی تھی۔ یہ انگریزوں کا زمانہ تھا۔ مسلمانوں نے دانش مندی سے کام لیا۔ چنانچہ انگریز اس پر راضی ہوگئے کہ مسجد کی عمارت کو نہ چھیڑتے ہوئے ریلوے لائن کو مسجد کے دائیں اور بائیں سے نکالا جائے۔

اس منظر کو دیکھ کر مجھے ۱۹۱۳ کا واقعہ یاد آیا جب کہ کانپور (مچھلی بازار) کی ایک مسجد کے غسل خانہ کی دیوار کا ایک کونا روڈ کو سیدھا کرنے کے لئے توڑا گیا تو اس وقت کے مسلم لیڈروں نے سارے ملک میں اس

پر ہنگامہ کھڑا کر دیا۔ اس زمانہ کے کئی مسلم لیڈر اسی واقعہ کے بعد مشہور ہوئے۔ اگر چہ ان کو اپنی یہ ذاتی شہرت اس قیمت پر ملی کہ انہوں نے مسلمانوں کے دل میں انگریزوں کے خلاف نفرت پیدا کر کے داعی اور مدعو کے رشتہ کو درہم برہم کر دیا۔

اس زمانہ میں کانپور کی مسجد کے اس واقعہ پر بہت سے مضامین اور اشعار لکھے گئے۔ مولانا شبلی نعمانی نے اس پر ایک پر جوش نظم لکھی تھی اس میں ڈرامائی انداز میں دکھایا گیا تھا کہ میں ایک جگہ پہنچا جہاں مسلمانوں کی خون آلود لاشیں پڑی ہوئی تھیں، اس کے بعد یہ شعر تھا:

پوچھا جو میں نے کون ہو تم، آئی یہ صدا　　ہم کشتگانِ معرکۂ کانپور ہیں

گہرائی کے ساتھ دیکھئے تو اس شعر کو کسی قدر تبدیلی کے ساتھ اس طرح کہنا زیادہ صحیح ہوگا:

پوچھا جو میں نے کون ہو تم، آئی یہ صدا　　ہم کشتگانِ معرکۂ بے شعور ہیں

برادرم محمد ثناء اللہ ندوی نے بتایا کہ وہ نہ صرف خود الرسالہ اور مطبوعات الرسالہ کو پڑھتے ہیں بلکہ دوسروں کو بھی پڑھاتے ہیں۔ اس سلسلہ میں اپنے تجربات کے دائرہ میں انہوں نے بتایا کہ ایک دن وہ اپنی دکان پر میری کتاب "مذہب اور جدید چیلنج" پڑھ رہے تھے۔ اس اثناء میں ایک مقامی عالم آگئے۔ انہوں نے پوچھا کہ آپ کون سی کتاب پڑھ رہے ہیں۔ ثناء اللہ صاحب نے کہا کہ یہ مولانا وحید الدین خاں کی کتاب "مذہب اور جدید چیلنج" ہے۔ انہوں نے یہ سنتے ہی کہا کہ لاحول ولا قوت۔ یہ تم کس کی کتاب پڑھ رہے ہو۔ یہ تو مسلم دشمنوں کے ایجنٹ ہیں، وہ معمر قذافی کے آدمی ہیں۔ ثناء اللہ صاحب نے کہا کہ کیا آپ نے ان کی کتابیں پڑھی ہیں۔ انہوں نے کہا کہ نہیں۔ ثناء اللہ صاحب نے ان سے کہا کہ پھر آپ نے بغیر جانے ہوئے کیسے رائے قائم کر لی۔ انہوں نے کہا کہ میں جانتا ہوں وہ تو لیبیا کے معمر قذافی کے ایجنٹ ہیں جو ایک بدنام دشمن اسلام ہے۔

جناب ثناء اللہ ندوی کے پاس اس وقت راقم الحروف کی کتاب غیر ملکی اسفار حصہ اول تھی جس کو وہ پڑھ چکے تھے۔ اس کتاب میں لیبیا کا ایک سفر نامہ شامل ہے جس میں معمر قذافی کے بارے میں یہ الفاظ چھپے ہوئے ہیں:

مجھے کرنل قذافی کی پالیسوں سے اتفاق نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ کرنل قذافی کے ثورہ (انقلاب) نے لیبیا کو نقصان زیادہ پہنچایا ہے اور فائدہ کم۔ اسلام کے بارے میں بھی ان کی بہت سی تعبیرات احمقانہ ہیں" (صفحہ ۱۱)

ثناء اللہ ندوی صاحب نے بتایا کہ اس اقتباس کو سننے کے بعد مذکورہ عالم اس قدر مبہوت ہوئے کہ وہ حیرانی کے ساتھ میری طرف دیکھنے لگے۔ ان کی خاموشی اس بات کی علامت تھی کہ وہ اس مطبوعہ اقتباس کو دیکھنے کے بعد سر تا سر لاجواب ہوگئے ہیں۔ مگر انہوں نے اس کا اعتراف کرتے ہوئے یہ نہیں کہا کہ میں اس معاملہ میں سخت غلطی پر تھا۔ بلکہ انہوں نے صرف یہ کیا کہ موضوع بدل کر دوسری بات شروع کر دی۔

لوگوں کی یہ عام کمزوری ہے کہ وہ اپنی غلطی کا اعتراف نہیں کرتے۔ خواہ اس پر کتنے ہی زیادہ دلائل دے دئے جائیں۔ ان میں سے کوئی شخص یہ کرتا ہے کہ دلائل کے مقابلہ میں بے بس ہو کر چپ ہو جاتا ہے اور کوئی شخص اس کے بعد بھی بے تکان بولتا رہتا ہے خواہ اس کو خود بھی اپنے بولے ہوئے الفاظ کا مطلب معلوم نہ ہو۔

راستہ میں ہم لوگ موتی ہاری سے گذرے۔ یہاں کچھ دیر کے لئے مدرسہ خیر العلوم میں قیام کیا۔ اس کے ناظم مولانا محمد عالم القاسمی ہیں۔ یہ مدرسہ ۱۹۷۴ میں قائم ہوا۔ یہاں ڈیڑھ سو طلبا کی تعلیم کا انتظام ہے۔ اساتذہ اور دوسرے کارکنوں کی تعداد سترہ ہے۔ یہ مدرسہ ایک پر سکون جگہ پر واقع ہے۔

اس طرح کے لاکھوں چھوٹے بڑے مدرسے پورے ملک میں خاموش کام کر رہے ہیں۔ وہ علم دین کو ایک نسل سے دوسری نسل تک پہنچا رہے ہیں۔ انہی مدارس کا یہ کارنامہ ہے کہ ہندستان میں آج علم دین زندہ ہے۔ مسلم ملکوں میں احیاء تعلیم کا یہ کام حکومتوں کے تعاون سے ہوتا ہے۔ ہندستان میں یہ کام علماء کی قربانیوں کے ذریعہ انجام پا رہا ہے۔ ہندستان میں اتنی بڑی تعداد میں مدارس دینیہ کی موجودگی اس خدائی ضمانت کی ایک زندہ مثال ہے جس کو حفاظت دین کہا جاتا ہے۔ مدارس کے موضوع پر میں نے ایک مفصل مقالہ شائع کیا ہے۔ یہ مقالہ ماہنامہ الرسالہ کے شمارہ ستمبر ۲۰۰۰ میں تفصیل کے ساتھ چھپا ہے۔

میں نے ظہر کی نماز اسی مدرسہ کی مسجد میں پڑھی۔ نماز کے بعد طلباء و اساتذہ کے سامنے ایک مختصر خطاب کیا۔ اس خطاب میں میں نے کہا کہ یہ مدارس ایک عظیم خدمت انجام دے رہے ہیں۔ یہ ادارے اس تحفظ دین کا ذریعہ ہیں جس کا فیصلہ اللہ نے فرمایا ہے۔ اللہ کا یہ فیصلہ اسباب کے اعتبار سے زیادہ تر انہیں مدارس کے ذریعہ انجام پا رہا ہے۔

سفر کے دوران اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ الرسالہ مشن کس طرح لوگوں کے دلوں میں اپنی جگہ بنا رہا ہے۔ مثلاً اس سفر میں ایک واقعہ پیش آیا۔ میرے اس سفر کا پروگرام طے کرنے کے بعد مولانا عبد الرحیم امدادی نے مختلف مقامات کے سفر کئے تا کہ پروگرام کا نظام بنا سکیں۔ اس سلسلہ میں وہ ڈھاکہ گئے۔ وہاں ان کو

جناب عطاء اللہ ڈھاکوی سے ملنا تھا۔ ایک کپڑے کے تاجر سے انہوں نے عطاء اللہ صاحب ڈھاکوی کا پتہ پوچھا۔ اس تاجر نے اپنے قیاس کے ذریعہ مولانا عبدالرحیم امدادی سے کہا "غالباً آپ مولانا وحید الدین کے پروگرام کے سلسلہ میں یہاں آئے ہیں"۔

انہوں نے کہا کہ ہاں، تاجر نے کہا کہ میں خود بھی مولانا کا شیدائی ہوں۔ اس کے بعد مذکورہ تاجر مولانا عبدالرحیم امدادی کو اپنی دکان میں لے گئے اور کہا کہ میں بھی آپ کے ساتھ اس پروگرام میں شریک ہوں۔

یہ تاجر محمد ثناء اللہ ندوی تھے۔ انہوں نے الرسالہ مشن کی کافی کتابیں پڑھی ہیں اور وہ پوری طرح اس مشن میں شامل ہو چکے ہیں۔ مگر اس سے پہلے ان کا تعارف اس حیثیت سے نہ مجھ سے تھا اور نہ کسی اور سے۔ یکم نومبر ۲۰۰۰ سے پہلے میں محمد ثناء اللہ ندوی کا نام بھی نہیں جانتا تھا۔ مگر اس سفر کے دوران ان کا جو تعارف ہوا اس سے معلوم ہوا کہ وہ خود اپنی ذات میں دعوت کی ایک تاریخ لئے ہوئے ہیں۔ انہوں نے اپنی دعوتی زندگی کے کئی ایسے واقعات بتائے جو میرے جیسے آدمی کے لئے بلاشبہ حیرت انگیز ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ ڈھاکہ میں ایک نوجوان محمد نسیم احمد ہیں۔ میں ان کو تقریباً پانچ سال سے جانتا تھا لیکن مجھے یہ پتہ نہ تھا کہ وہ الرسالہ مشن سے گہرا تعلق رکھتے ہیں۔

موجودہ پروگرام کے تحت عبدالرحیم امدادی صاحب ڈھاکہ آئے۔ وہ ان کی دکان پر بیٹھے ہوئے تھے کہ اس درمیان اتفاق سے محمد نسیم صاحب وہاں آگئے۔ انہوں نے نسیم صاحب کو پروگرام کی بابت بتایا۔ وہ بہت خوش ہوئے اور پھر انہوں نے اپنے بارے میں یہ بات بتائی کہ وہ الرسالہ مشن کی ساری کتابیں پڑھ چکے ہیں۔

انہوں نے الرسالہ کے بہت سے شمارے دہلی سے منگوا کر تقسیم کئے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ میں بہار کے اس پروگرام میں شروع سے اخیر تک شریک رہوں گا۔

ایک عجیب سبق آموز بات معلوم ہوئی کہ بہار کا موجودہ پروگرام اتفاق سے ایسے وقت میں ہوا جب کہ یہاں ہندوؤں میں چھٹ تیوہار پڑ رہا تھا۔ یہ کپڑے کی تجارت کے لئے سیزن کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ محمد ثناء اللہ ندوی کے لئے ایک آزمائش کا لمحہ تھا۔ وہ دکان میں بیٹھ کر سیزن کا فائدہ اٹھائیں یا دکان کو بند کر کے ہمارے پروگراموں میں شرکت کریں۔ پروگرام میں شرکت کے لئے دکان کو بند کرنا ضروری تھا کیوں کہ ان کی غیر موجودگی میں دوسرا کوئی شخص نہ تھا جو دکان کو دیکھے۔

۳۱ اکتوبر ۲۰۰۰ کو وہ اپنی دکان پر تھے، شام ۳ بجے تک سترہ ہزار روپئے کی بکری ہو چکی تھی۔ اور

خریداروں کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ تین بجے انہوں نے فیصلہ کیا کہ بہر حال مجھے پروگرام میں شرکت کرنا ہے۔ چنانچہ انہوں نے گاہکوں کی بھیڑ چھوڑدی اور دکان کو بند کر کے اللہ پر توکل کرتے ہوئے پٹنہ کے لئے روانہ ہوگئے۔ یکم نومبر کو محمد ثناء اللہ ندوی نے اپنا یہ واقعہ بتایا تو میری آنکھوں میں بے اختیار آنسو آگئے۔ میں نے کہا کہ خدایا تو اس نوجوان کی اور ہم سب کی مدد فرما۔

بمبئی کے مسٹر نسیم علی خاں صاحب سے ملاقات ہوئی۔(Tel. 022-8210416)انہوں نے بتایا کہ بمبئی میں بہار کے لوگ کثرت سے ہیں۔ اور ان میں سے بہت سے لوگ الرسالہ کے قاری ہیں۔ بمبئی کی بہار کمیونٹی کے کئی ممتاز لوگ الرسالہ مشن سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ اور الرسالہ کے قاری ہیں۔ مثلاً انجمن باشندگان بہار کے صدر مسٹر فاروق اور اس انجمن کے سکریٹری مسٹر فیروز احمد شیخ، وغیرہ۔

انہی میں سے بہار کے ایک ممتاز دانشور اور صحافی اور افسانہ نگار مسٹر محمود ایوبی ہیں۔ وہ آج کل بمبئی میں رہتے ہیں۔(Tel. 022-6395408) اس سے پہلے وہ ہفتہ وار اردو بلٹز کے اگزیکیٹیو ایڈیٹر رہ چکے ہیں۔ آج کل وہ آزاد صحافی کے طور پر مختلف اخباروں میں مضامین لکھتے ہیں۔ محمود ایوبی صاحب کے بارے میں جناب نسیم علی خاں صاحب نے بتایا کہ وہ الرسالہ مشن کی بہت قدر کرتے ہیں۔ نسیم صاحب نے کہا:

"محمود ایوبی صاحب الرسالہ کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے اکثر کہا کرتے ہیں کہ ہم کو تو ہندستان میں صرف ایک ہی مولانا نے متاثر کیا ہے اور وہ ہیں مولانا وحید الدین خاں۔ میں نے ان کے کہنے اور کرنے میں کہیں تضاد نہیں پایا۔ ان کا دوٹوک الفاظ میں بات کرنا اور مشکل سے مشکل مسئلہ کا حل آسان طور پر بیان کر دینا ان کا خاصہ ہے۔ ان کی تحریر اور ان کی رہنمائی حقیقت پسندی کا سبق دیتی ہے۔"

سید نعیم اختر صاحب منشاء ٹولہ سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے کہا کہ آج کل دنیا بھر کے علماء جہاد کی باتیں کرتے ہیں۔ یہ لوگ ہر ملک کے مسلمانوں کو جہاد کے اوپر ابھارتے ہوئے ہیں۔ صرف آپ ایک ایسے عالم ہیں جو جہاد اور ٹکراؤ کی بات نہیں کرتے۔ ایسا کیوں، کس طرح یہ سمجھا جائے کہ دونوں میں سے کون برحق ہے۔

میں نے کہا کہ جہاد کو بطور ایک شرعی حکم کے میں بھی اسی طرح مانتا ہوں جس طرح دوسرے علماء مانتے ہیں۔ مگر شریعت کے ہر حکم کی کچھ شرطیں ہیں، اسی طرح جہاد کی بھی کچھ لازمی شرطیں ہیں۔ پہلی بات یہ کہ تمام علماء کی متفقہ رائے کے مطابق، جہاد سے پہلے دعوت ضروری ہے۔ دعوت کی پرامن جدو جہد کے بغیر مسلح جہاد چھیڑنا اسلام میں سرے سے جائز ہی نہیں۔ میرا کہنا یہ ہے کہ موجودہ زمانہ میں ہمارا پہلا فریضہ یہ ہے کہ ہم دوسری قوموں تک اللہ کا پیغام پہنچائیں۔ نہ یہ کہ ملک و مال کی شکایتوں کو لے کر ان سے لڑنا شروع کر دیں۔ شرائط کی تکمیل کے بغیر جو جہاد کیا جائے وہ شریعت کی نظر میں فساد ہوگا نہ کہ جہاد۔

دوسری بات یہ کہ اگر بالفرض وہ حالات پیدا ہو جائیں جب کہ جہاد کرنا مسلمانوں کے لئے ضروری ہو جاتا ہے تب بھی جہاد سے پہلے اعداد (تیاری) کا مرحلہ طے کرنا ضروری ہو گا۔ اعداد کے بغیر جہاد صرف ایک خودکشی کا فعل ہے، وہ ہرگز جہاد نہیں۔

اکثر پرجوش مسلمان اس معاملہ میں غزوۂ بدر کا حوالہ دیتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ غزوۂ بدر میں فریقِ ثانی کی نسبت سے کوئی تیاری نہیں تھی پھر بھی مسلمانوں نے ان سے جنگ کی اور کامیاب ہوئے۔ میرے نزدیک ایسا کہنا صرف اس بات کا ثبوت ہے کہ کہنے والا مجرمانہ حد تک قرآن سے ناواقف ہے۔ قرآن سے واضح طور پر ثابت ہے کہ جب یہ اطلاع ملی کہ مکہ سے ایک ہزار مسلح فوج مدینہ کی طرف آرہی ہے تو مسلمان اپنی عدم تیاری کی بنا پر ان سے مڈبھیڑ کے لئے راضی نہ تھے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان کے پاس یہ خوش خبری بھیجی کہ تم لوگ آگے بڑھو، میں تمہاری مدد کے لئے ایک ہزار فرشتے لگاتار بھیج رہا ہوں (الانفال ۹)

اللہ تعالیٰ کی اس واضح یقین دہانی کے بعد مسلمان کمزور یا تیاری کے بغیر نہیں رہے، بلکہ وہ تمام طاقتوروں سے زیادہ طاقت ور ہو گئے۔ یہی وجہ ہے کہ بدر کی لڑائی میں مسلمانوں کو فیصلہ کن فتح حاصل ہوئی، جب کہ موجودہ زمانہ کے مسلمان بدر کا حوالہ دے کر کم از کم ڈیڑھ سو سال سے بار بار لڑ رہے ہیں۔ اور ہر موقع پر یکطرفہ شکست سے دوچار ہوئے ہیں۔ اگر وہ "بدر" کو دہرا رہے ہیں تو بدر کا نتیجہ ان کے حصہ میں کیوں نہیں آیا۔

بہار کا یہ سفر ایک قافلہ کی صورت میں تھا۔ ایک ہزار کلومیٹر کے پورے سفر میں یہ قافلہ میرے ساتھ رہا۔ اس بناء پر یہ سفر ایک چلتا پھرتا اجتماع بن گیا۔ ایک ہفتہ کے پورے سفر میں رات اور دن گفتگوؤں اور تبادلۂ خیال کا سلسلہ جاری رہا۔ ان میں سے کچھ باتیں اس سفرنامہ میں شامل ہیں۔

ڈھاکہ جاتے ہوئے راستہ میں ہم لوگ موتی ہاری سے گزرے، یہ بہار کا مشہور شہر ہے۔ بہار کے پچھلے سفر جون ۲۰۰۰ کے موقع پر موتی ہاری میں میرا ایک خطاب ہوا تھا۔ دہلی واپسی کے بعد وہاں کے ایک مسلم نوجوان نے بتایا کہ موتی ہاری کے ایک طالب علم دہلی میں پڑھتے ہیں وہ اپنے وطن سے یہ خبر لائے ہیں کہ مولانا وحید الدین موتی ہاری آئے تھے، یہاں تو انہوں نے کلنٹن اور امریکہ کی باتیں کیں۔ کچھ معلوم نہیں کہ اس سے ان کا مقصد کیا تھا۔

میں نے کہا کہ یہ اسی قسم کا اعتراض ہے جیسے قدیم مدینہ کے یہود نے قرآن کے بارے میں کہا تھا کہ یہ کیسا خدائی کلام ہے کہ اس میں مکھی اور مچھر کی باتیں ہوتی ہیں۔ (القرطبی ۱ر۲۴۲) مفسرین لکھتے ہیں کہ یہود اس طرح قرآن کا مذاق اڑاتے تھے۔ مگر یہ کوئی سادہ بات نہیں۔ اصل یہ ہے کہ جو لوگ اپنے تعصبات کی بنا پر حق کا اعتراف کرنے کے لئے تیار نہ ہوں، وہ ہمیشہ تضحیک کا انداز اختیار کرتے ہیں۔ وہ

صاحب حق کا مذاق اڑا کر یہ ظاہر کرتے ہیں کہ اس کی بات اتنی بے وزن ہے کہ وہ ماننے کے قابل ہی نہیں۔

ایک چیز بہار کی پہچان بن گئی ہے اور وہ ہے بہار کی ٹوٹی ہوئی سڑکیں۔ دہلی سے پٹنہ پہنچنے کے لئے میں نے ایک ہزار کیلو میٹر ٹرین کے ذریعہ سفر کیا۔ یہ سفر پر سکون طور پر طے ہو گیا۔ پٹنہ کے بعد دوبارہ مجھے تقریباً ایک ہزار کیلو میٹر کا سفر طے کرنا تھا۔ یہ بہار کے اندرونی مقامات میں ہوا۔ یہ دوسرا سفر میری زندگی کا ایک عجیب تجربہ تھا۔ کار آہستہ رفتار کے ساتھ اس طرح چل رہی تھی جیسے کہ ہر قدم پر ایک گڑھا موجود ہے اور کار ان سے گزرتے ہوئے آگے بڑھ رہی ہے۔ بہار میں سڑکوں کے نام پر جو چیز ہے اس کو جدید اصطلاح میں شاید سڑک کہنا مشکل ہے۔ ان ناہموار سڑکوں پر گذرتے ہوئے مجھے ایک کارٹون یاد آیا۔ جو امریکہ کے مشہور صنعت کار بل گیٹس کی آمد (اکتوبر ۲۰۰۰) پر ٹائمس آف انڈیا میں شائع ہوا تھا۔

اس کارٹون میں بل گیٹس اور بہار کی چیف منسٹر کے درمیان ایک مفروضہ ملاقات کا ذکر ہے۔ بل گیٹس بہار کی چیف منسٹر رابڑی دیوی سے ملاقات کے دوران کہتے ہیں: اگر آپ نے میری وہ کتاب پڑھی ہو جس کا نام روڈ اہیڈ ہے تو...... رابڑی دیوی بات کو کاٹتے ہوئے درمیان میں کہہ اٹھتی ہیں کہ روڈ اہیڈ! آپ کس چیز کی بات کر رہے ہیں۔ بہار میں آگے کا روڈ تو درکنار، یہاں پیچھے بھی کوئی روڈ نہیں اور نہ دائیں طرف اور نہ بائیں طرف۔ بہار میں سرے سے کوئی روڈ نہیں۔ کیا آپ روڈ بنانے کے لئے بہار آئیں گے۔

> **Bill:** Well, yes, if you've read my book *The Road Ahead* you'll know....
>
> **Rabri:** Road ahead? What you are talking? In Bihar let alone road ahead there is no road behind. Or on right side, or left side. In fact, there is no road at all in Bihar. You will come to build a road in Bihar.

یکم نومبر کی شام کو چار بجے ہم لوگ ڈھاکہ پہنچے۔ یہاں بہت سے لوگوں سے ملاقات ہوئی۔ نماز عصر کے بعد ڈھاکہ کی صغریٰ اردو لائبریری میں پروگرام ہوا۔ یہاں شہر کے تعلیم یافتہ لوگ اکٹھا ہوئے۔ ان میں سے بیشتر لوگ الرسالہ مشن سے واقف تھے۔

صغریٰ لائبریری میں عصر و مغرب کے درمیان ایک تقریر ہوئی۔ یہاں لوگ اتنی زیادہ تعداد میں آئے کہ ہال کی کرسیاں ناکافی ہو گئیں۔ بہت سے لوگوں نے باہر کھڑے ہو کر تقریر سنی۔ میں نے اپنی تقریر میں کہا کہ ہمارا عقیدہ ہے کہ اسلام ایک مکمل ضابطہ ہے مگر یہ کیمونسٹ ٹائپ کا کوئی نظریہ نہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم سیاسی اکھیڑ پچھاڑ کے ذریعہ حکومت پر قبضہ کرنے کی کوشش کریں تاکہ اسلام کے

قوانین کو لوگوں کے اوپر نافذ کیا جائے۔ مکمل ضابطۂ حیات کا اصل مطلب یہ ہے کہ ہر مسلمان اسلام سے اپنی زندگی کے لئے رہنمائی حاصل کرے۔ جب بھی اس کے سامنے کوئی صورت حال آئے خواہ اس کا تعلق گھر کے اندر سے ہو یا گھر کے باہر سے، تو وہ قرآن و سنت میں تلاش کر کے معلوم کرے کہ اس صورت حال میں اس کے لئے کیا رہنمائی ہے۔ اور پھر جو رہنمائی ملے اس کو بے چوں چرا قبول کر لے۔ اسلام کا مکمل ضابطہ ہونا ذاتی پیروی کے معنی میں ہے نہ کہ خارجی نفاذ کے معنی میں۔

میں نے مثال دیتے ہوئے کہا کہ ہندستان میں ۱۹۴۷ کے بعد مسلسل تمام لکھنے اور بولنے والے مسلمان صرف یہ کرتے رہے ہیں کہ وہ سازشوں کا انکشاف کر رہے ہیں، وہ مسلمانوں کو یہ خبر دیتے رہے ہیں کہ یہاں ان کے لئے دوسرا اسپین بنایا جانے والا ہے۔ اور مسلمانوں کو بتا رہے ہیں کہ ان کے لئے یہاں ترقی کے مواقع نہیں ہیں۔ ہر آدمی مایوسی کی بولی بول رہا ہے۔ حالانکہ قرآن میں مایوسی سے روکا گیا ہے (یوسف ۸۷)۔

اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ ہر حال میں امید اور حوصلہ کی بات کہی جائے، سخت ترین حالات میں بھی مایوسی کی بات نہ کی جائے۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ غزوۂ خندق کے موقع پر دشمنوں کی طرف سے اتنا سخت محاصرہ کیا گیا کہ مسلمانوں کو ضروریات تک کے لئے باہر جانا مشکل ہو گیا۔ مگر اس وقت بھی رسول اللہ اپنے اصحاب کو یہ بشارت دے رہے تھے کہ تم لوگ قیصر و کسریٰ کے خزانے حاصل کرو گے۔

معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سخت ترین حالات میں بھی مسلمانوں سے مایوسی کی بات نہیں کرتے تھے۔ بلکہ ہر حال میں لوگوں کو اچھی خبر دیتے تھے۔ اسلام کے مکمل ضابطۂ حیات ہونے کا تقاضہ یہ تھا کہ نئے ہندستان میں اسلام کی اس تعلیم کے مطابق مسلمانوں کے سامنے ملک کی امید افزا تصویر پیش کی جائے۔ مگر یہ لکھنے والے اور بولنے والے لوگ ایک طرف اس پر فخر کرتے تھے کہ اسلام مکمل ضابطۂ حیات ہے، مگر عین اسی وقت وہ مذکورہ اسلامی ضابطے کو مکمل طور پر ترک کئے ہوئے تھے۔ ۳۰ منٹ کی تقریر کے خاتمہ پر لوگوں نے مختلف قسم کے سوالات کئے جس کا جواب میں دیر تک دیتا رہا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ابھی لوگ بہت دیر تک مزید سننا چاہتے ہیں مگر پروگرام کے مطابق وہاں سے مجھے روانہ ہونا پڑا۔

جناب مطیع الرحمٰن صاحب سابق ایم ایل اے کے مکان پر ایک مختصر اجتماع ہوا۔ یہاں کئی لوگوں سے ملاقات ہوئی۔ جناب مطیع الرحمٰن صاحب میری تحریریں پڑھتے رہے ہیں۔ انہوں نے اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ آپ کا فکر عصری فکر کے مطابق ہے۔ آپ موجودہ نسل کو عصری معیار کے مطابق رہنمائی دینے کا کام کر رہے ہیں۔ انہوں نے مزید کہا کہ مسلمانوں میں جو اعتقادی و مسلکی جھگڑے ہیں ان سے مجھ کو کوئی دلچسپی نہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان جھگڑوں سے بچتے ہوئے ملت کو

آگے بڑھانا چاہئے اور یہی بات میں نے آپ کی تحریروں میں پائی ہے۔

یکم نومبر کو نماز مغرب کے بعد مقامی ہائی اسکول کے وسیع گراؤنڈ میں عمومی اجتماع ہوا۔ ایک اندازہ کے مطابق حاضرین کی تعداد تقریباً تین ہزار تھی۔ یہاں میں نے اپنی ۴۵ منٹ کی تقریر میں خاص طور پر یہ کہا کہ اس ملک میں جو مسئلہ ہے وہ ہندو بمقابلہ مسلم یا مسلم بمقابلہ ہندو کا نہیں ہے۔ بلکہ ہندو اور مسلمان دونوں کا مقابلہ فطرت سے ہے۔ دونوں ہی فرقوں کو فطرت کے نظام کو اور تاریخی عوامل کو سمجھنا ہے اور اس کے مطابق اپنی زندگی کی تعمیر کرنا ہے۔ فطرت کے قوانین کو نظر انداز کر کے نہ مسلمان ترقی کر سکتے ہیں اور نہ ہندو۔

لوگوں نے بتایا کہ آج اتفاق سے ہندوؤں کا ایک مقدس تہوار ہے جس کو وہ لوگ چھٹ تیوہار کہتے ہیں۔ جو وقت جلسہ کا تھا عین وہی وقت ہندوؤں کی پوجا کا تھا۔ اس لئے اس عمومی جلسہ میں ہندو نسبتاً کم آسکے۔ اگر یہ رکاوٹ نہ ہوتی تو یقیناً ہندو لوگ بڑی تعداد میں شریک ہوتے۔

یکم نومبر کو شام کا کھانا عطاء اللہ ڈھاکوی صاحب کے یہاں تھا۔ یہاں کافی لوگ اکٹھا ہوئے اور دیر تک مختلف دینی و ملی موضوعات پر باتیں ہوتی رہیں۔ لوگ اپنے شبہات پیش کرتے رہے۔ اور میں اللہ کی توفیق سے ان کا جواب دیتا رہا۔

ایک صاحب جو مدرسہ سے فارغ تھے انہوں نے کہا کہ آپ نے علماء کے کارناموں پر کچھ نہیں لکھا۔ اس کا سبب کیا ہے۔ میں نے کہا کہ شاید آپ ماہنامہ الرسالہ کا مطالعہ نہیں کرتے ہیں۔ ابھی ستمبر ۲۰۰۰ کا شمارہ جو خصوصی طور پر ۸۰ صفحات میں شائع ہوا ہے وہ پورا کا پورا شمارہ علماء کے کارناموں ہی پر مشتمل ہے۔

جناب عطاء اللہ صاحب ڈھاکوی کے یہاں شام کے کھانے کے بعد ہم لوگ جناب مطیع الرحمٰن صاحب سابق ایم ایل اے کے یہاں گئے اور رات ان کے مکان پر گزاری۔ فجر کی نماز کے بعد میں نے درس حدیث کی صورت میں کچھ باتیں کہیں۔ میں نے کہا کہ اسلام کی جو عبادات ہیں وہ کوئی پر اسرار چیز نہیں۔ دین ایک زندہ عمل ہے نہ کہ پر اسراریت کا کوئی مجموعہ۔ موجودہ زمانہ میں لوگوں کا حال یہ ہے کہ لوگ نماز پڑھتے ہیں مگر دین ان کی عملی زندگیوں میں شامل نہیں۔ اس کا سبب یہی ہے کہ وہ نماز کو شعوری یا غیر شعوری طور پر رسمی افعال کا ایک پر اسرار مجموعہ سمجھتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ نماز سے ان کا ذہن بیدار نہیں ہوتا۔ وہ ان کو باشعور انسان نہیں بناتی۔ ایسی نماز انسان کی زندگی میں بس ایک ضمیمہ کے طور پر رہے گی۔

پھر میں نے لوگوں کو ایک حدیث سنائی۔ وہ حدیث یہ ہے کہ من صلی الصبح فھو فی ذمة اللہ (مسلم کتاب المساجد) پھر اس حدیث کی مختصر تشریح کی۔ ۲ نومبر کی صبح کو فجر کے بعد محمد نسیم احمد ولد جمیل احمد کے مکان پر اجتماع ہوا۔ کافی لوگ جمع ہوئے۔ یہاں پر اتحاد کے موضوع پر ایک تقریر ہوئی۔ میں

نے کہا کہ اس وقت مسلمانوں میں ایک عجیب وغریب منظر دکھائی دیتا ہے۔ وہ یہ کہ قوم کے کروروں لوگ روزانہ پانچ وقت کی باجماعت نماز ادا کرتے ہیں۔ عین اسی وقت کہیں بھی مسلمانوں کے درمیان اتحاد موجود نہیں۔ حالانکہ نماز باجماعت اتحاد کا عظیم سبق ہے۔ نماز باجماعت اس بات کی عملی تربیت ہے کہ تم لوگ خواہ دس ہو یا دس ہزار ہو یا اس سے زیادہ ہو، اپنے میں سے ایک شخص کو آگے کھڑا کر کے بقیہ سب کے سب بیک سیٹ پر چلے جاؤ۔ یہ طریقہ اتحاد کا سب سے زیادہ طاقتور ذریعہ ہے۔ جس قوم میں ہر آدمی اپنی بات چلانا چاہے اس میں بے اتحادی ہو گی اور جس قوم میں یہ مزاج ہو کہ سب لوگ اپنی بات کو پیچھے کر کے ایک شخص کی بات مان لیں تو اسی کے نتیجہ کا نام اتحاد ہے۔ مگر آج نماز باجماعت کا یہ نتیجہ کہیں موجود نہیں۔

اس کا سبب کیا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ لوگ مسجد میں نماز باجماعت تو ادا کرتے ہیں مگر نماز باجماعت کے شعور سے وہ یکسر خالی ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ مسجد میں جاکر نماز ادا کرو اور اس کے بعد پراسرار طور پر اس کی برکتیں ہمیں حاصل ہو جائیں گی۔ ضرورت ہے کہ نماز کو ایک زندہ عمل کے طور پر لوگوں کے درمیان قائم کیا جائے نہ کہ ایک پراسرار قسم کے رسمی عمل کے طور پر۔

۲ نومبر کی صبح کو آزاد مدرسہ اسلامیہ ڈھاکہ کا معائنہ کیا۔ یہ مدرسہ ۱۹۴۲ میں قائم کیا گیا۔ اس مدرسہ کا قیام مولانا حسین احمد مدنی کی تحریک پر عمل میں آیا۔ اس مدرسہ کے ناظم قاری محمد انوار الحق اور صدر مدرس مولانا عبد السلام صاحب ہیں۔ یہاں طلبا و اساتذہ کے سامنے ایک مختصر خطاب کیا۔ اس موقع پر میں نے مختصر طور پر علم کی اہمیت بتائی۔ میں نے کہا کہ اس دنیا میں علم ہی طاقت کا سرچشمہ ہے۔ قدیم زمانہ میں اہل اسلام دنیا میں غالب ہوئے تو اس کا راز شمشیر نہیں تھا بلکہ علم تھا۔ اسی طرح موجودہ زمانہ میں اہل مغرب نے دنیا میں جو غلبہ حاصل کیا ہے اس کا راز بھی اہل مغرب کی سازش نہیں ہے بلکہ علم ہے۔ علم طاقت ہے (Knowledge is Power)۔ یہ اصول ہر ایک کے لئے ہے۔ میں نے کہا کہ آپ لوگوں کو بیک وقت دو چیزوں میں کمال حاصل کرنا ہے —— دین اور علم۔ دونوں میں سے کسی ایک کی کمی بیک وقت دونوں ہی کے لئے نقصان کا باعث ہو گی۔

نسیم احمد صاحب کے مکان پر خطاب کے بعد جب میں وہاں سے اٹھ کر جانے لگا تو ایک پرجوش نوجوان نے نعرہ لگایا۔ "مولانا وحید الدین زندہ باد" میں نے کہا کہ دنیوی تحریکیں شور کے اوپر کھڑی ہوتی ہیں، لیکن سچی اسلامی تحریک ہمیشہ خاموشی پر کھڑی ہوتی ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ من صمت نجا۔ (جو چپ رہا اس نے نجات پائی)۔

اس حدیث کا تعلق شخصی کردار سے بھی ہے اور اجتماعی پالیسی سے بھی۔ خاموشی کوئی انفعالی روش

نہیں، خاموشی پورے معنوں میں ایک عمل ہے۔ خاموشی دراصل سوچی سمجھی روش کا نام ہے۔ اس کے برعکس شور یہ ہے کہ آدمی وقتی جذبات کے تحت ہنگامہ آرائی کرنے لگے۔ خاموش عمل منصوبہ بند عمل ہے اور پر شور عمل غیر منصوبہ بند عمل۔

ایک پندرہ سالہ بچہ ابراہیم ڈھاکوی سے مجھ کو ملایا گیا۔ اس کے والد نے کہا کہ یہ بچہ پڑھنے میں محنت کرتا ہے لیکن اس کو کچھ یاد نہیں رہتا۔ میں نے کہا کہ اس سے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ دنیا کے بہت سے بڑے لوگ اپنی ابتدائی عمر میں کمزور طالب علم کی حیثیت رکھتے تھے۔ مگر یہی لوگ تھے جنہوں نے بعد کو بڑے بڑے کارنامے انجام دئے۔ فطرت کی طرف سے ہر انسان کو صلاحیتیں دی جاتی ہیں۔ البتہ کسی کی صلاحیت شروع ہی سے نمایاں ہو جاتی ہے اور کسی کی صلاحیت بعد کو ظہور میں آتی ہے۔

کچھ لوگوں نے کہا ہمارے علاقہ میں آپ کے خلاف بہت سی کتابیں پھیلائی جارہی ہیں۔ اور مخالفانہ لٹریچر لوگوں کے درمیان تقسیم کیا جارہا ہے، آپ اس کے ازالہ کے لئے کچھ کیجئے۔ میں نے کہا کہ مخالفت نے کبھی کسی مشن کا راستہ نہیں روکا۔ اللہ نے آغاز انسانیت ہی میں اس کی ایک مثال آدم وابلیس کی صورت میں قائم فرمادی۔ ابلیس نے آدم کی زبردست مخالفت کی بلکہ اس کو اپنا ابدی مشن بنالیا مگر تاریخ ثابت کرتی ہے کہ ابلیس کی مخالفت آدم کے عروج کو روکنے میں کامیاب نہ ہو سکی۔ آپ لوگ اپنے مثبت کام میں مشغول رہئے۔ جہاں تک مخالفتوں کا تعلق ہے تو قدرت کا قانون ہی ان کے ازالہ کے لئے کافی ہے۔

مدرسہ آزاد اسلامیہ سے روانہ ہو کر ہم لوگ ڈاکٹر صغیر احمد کی رہائش گاہ پر پہنچے۔ راستہ میں ہمارے ساتھ جناب عطاء اللہ ڈھاکوی بھی تھے۔ جو پہلے کمیونسٹ تحریک کے علاقائی لیڈر تھے۔ ان کی زندگی میں یہ انقلاب کیسے ہوا اس کو انہوں نے خود اپنے الفاظ میں یوں بیان کیا کہ پہلے میں کمیونسٹ تحریک کا پر جوش مبلغ تھا۔ اب میں الرسالہ تحریک کا خاموش داعی بن گیا ہوں اور یہ میرے لئے ایک نئی زندگی کے ہم معنی ہے۔ اس نے مجھے ایک نئی زندگی دی ہے۔ پہلے میں سرمایہ دار کی نفرت میں جیتا تھا۔ اب میں سرمایہ دار سمیت تمام انسانوں کی محبت میں جیتا ہوں۔

جناب ایم ٹی خان صاحب نے ایک بات کہی۔ اس پر اضافہ کرتے ہوئے میں نے کہا کہ لوگ کامیابی اس کو سمجھتے ہیں کہ وہ اپنے مقصد کو پالیں۔ مگر کامیابی کا راز یہ ہے کہ لوگ مواقع کار کو پالیں۔ مثلاً آج کل پوری مسلم دنیا میں ٹکراؤ کا ماحول ہے۔ ان سے اگر امن کے لئے کہا جائے تو فوراً ہر عرب کہے گا کہ امن کس لئے۔ اس وقت سارا عرب ذہن یہی ہے۔ اسی طرح دوسرے علاقوں کے مسلمان یہ سمجھتے ہیں کہ امن وہ ہے جس سے عدل حاصل ہو۔ عدل کے بغیر امن کوئی چیز نہیں۔

یہ بات قانون فطرت کے خلاف ہے۔ قانون فطرت کے مطابق امن مواقعِ کار کے حصول کے لئے ہوتا ہے نہ کہ عدل کے حصول کے لئے۔ عدل مواقعِ کار کو استعمال کرنے سے حاصل ہوتا ہے، وہ امن کے ساتھ بندھا ہوا نہیں آتا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیبیہ کا امن معاہدہ کیا تو اس معاہدہ کے ساتھ ساتھ آپ کو عدل نہیں ملا بلکہ اس سے پیدا شدہ مواقع کو استعمال کر کے آپ نے عدل کو حاصل کیا۔

۲ نومبر کو دس بجے ہم لوگ جامعۃ الامام ابن تیمیہ پہنچے۔ اس ادارہ کی بنیاد ۱۹۶۴ میں رکھی گئی۔ اس جامعہ کو دیکھ کر میرے اوپر ایک عجیب تاثر ہوا۔ میں نے بعض ہندی اور انگریزی اخباروں میں پڑھا تھا کہ نیپال کی سرحد کے قریب مسلمانوں نے اپنے تعلیمی ادارے بنائے ہیں جہاں جنگجوئی کی تربیت دی جاتی ہے۔ جامعہ ابن تیمیہ نیپال کی سرحد سے صرف تین کلومیٹر کے فاصلہ پر واقع ہے۔ اور مذکورہ رپورٹوں میں خصوصی طور پر اس کا بھی ذکر تھا۔ میں نے اگرچہ اس سے پہلے ٹی وی انٹرویو میں اس کی تردید کرتے ہوئے کہا تھا کہ میں خود مدرسہ ہی کا ایک پروڈکٹ ہوں۔ اور اگر آپ لوگ مجھ کو ایک امن پسند انسان سمجھتے ہیں تو اسی سے سمجھ لیجئے کہ ہر مدرسہ امن پسندی کی تربیت گاہ ہے۔

آج جب میں نے جامعہ کے کیمپس میں قدم رکھا تو میری آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہہ پڑے۔ یہ آنسو اس درد کے تحت نکلے تھے کہ ہمارا ملک کتنی بڑی حقیقت سے بے خبر ہے۔ جامعہ ابن تیمیہ میں مجھے ہر طرف امن، اور انسانی خیر خواہی اور علم دوستی کا ماحول نظر آیا۔ ایسا ادارہ بلاشبہ ملک کے لئے ایک سرمایہ کی حیثیت رکھتا ہے، مگر کیسے عجیب ہیں وہ لوگ جو اس قسم کے تعمیری اداروں پر بے بنیاد طور پر تخریب کا الزام لگائیں۔ تاہم یہاں آنے کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ مدارس کے بارے میں جس غلط پروپیگنڈے کی تردید میں دیکھے بغیر قیاس کی بنیاد پر کر رہا تھا اب میں خدا کے فضل سے اس کی تردید مشاہدہ کی بنیاد پر کر سکتا ہوں۔

جامعہ میں خواتین کا ایک مدرسہ بھی ہے اس کو بھی دیکھا۔ اس کا ایک الگ اور مستقل کیمپس ہے۔ اس میں دار الاقامہ سے لے کر مسجد تک ہر چیز موجود ہے۔ پچھلے سالوں میں ہندستان کے مسلمانوں میں خصوصی طور پر یہ رجحان پیدا ہوا ہے کہ وہ اپنی لڑکیوں کو پڑھائیں۔ چنانچہ بہت سے مدرسے اور اسکول خواتین کی تعلیم کے لئے قائم ہوئے ہیں۔ یہ بلاشبہ ایک روشن علامت ہے۔

جامعہ الامام ابن تیمیہ چندہ باڑی پندرہ ایکڑ کے رقبہ میں واقع ہے۔ اس کے مختلف شعبوں کو دیکھنے کے لئے مجھے کار سے چلنا پڑا۔ اس کے وسیع کیمپس میں چلتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے یہاں زمین کے اوپر ایک اسلامک یونیورسٹی ابھر رہی ہو۔ دل سے دعا نکلی کہ اللہ اس ادارہ کو وہ ادارہ بنائے جو اسلام کی جدید ضرورتوں کو پورا کرنے والا ہو۔ میں نے یہاں کے اساتذہ کی ایک مجلس میں کہا کہ دعوتی نقطۂ نظر سے

موجودہ زمانہ کا سب سے بڑا کام اسلام کو جدید ذہن کے لئے قابل فہم بنانا ہے۔ دعوت کا کام ایک دو طرفہ عمل ہے۔ اس میں ایک طرف داعی ہوتا ہے اور دوسری طرف مدعو۔ دعوت کے عمل کو درست طور پر انجام دینے کے لئے ضروری ہے کہ داعی اپنے مدعو کے ذہن کو سمجھے۔ اس کی زبان اور اس کا اسلوب کلام ایسا ہو جو اس کے مدعو کے لئے قابل فہم ہو، جو مدعو کو سوچنے پر مجبور کر دے۔

۲ نومبر کو ۹ بجے ڈاکٹر صغیر احمد صاحب کی رہائش گاہ پر ایک اجتماع ہوا۔ یہاں تعلیم یافتہ مسلمان اکٹھا ہوئے، ان سے مختلف موضوعات پر باتیں ہوئیں۔ میں نے مختلف سوالات کے جواب دئے۔ ایک سوال یہ تھا کہ انگریزوں کے زمانہ میں مسلمان سرکاری ملازمتوں میں چھ فیصد تھے۔ آج ایک فیصد بھی نہیں ہیں۔ اور مسلمانوں کی تہذیب کے خلاف طرح طرح کی سازشیں ہو رہی ہیں۔ پھر ہم کو کیا کرنا چاہئے۔

اس کی وضاحت کرتے ہوئے میں نے کہا کہ اس طرح کے واقعات جب کسی قوم پر آتے ہیں تو وہ ہمیشہ تاریخ کے اسباب کے تحت آتے ہیں۔ ایسا ہر واقعہ دراصل ایک تاریخی process کی تکمیل ہوتا ہے۔ ایسی حالت میں مسئلہ کا حل شکایت اور احتجاج نہیں ہے، بلکہ یہ تاریخ کو ری پراسس کرنے کا مسئلہ ہے۔ جو قوم اس قسم کے حادثہ کا شکار ہو اس کو یہ کرنا ہوگا کہ وہ تاریخ میں ایک نیا عمل (پراسس) جاری کرے، اس مسئلہ کا دوسرا کوئی حل نہیں۔

مولانا ذکاء اللہ عبد القدوس صاحب نے کہا کہ قرآن میں واضح طور پر یہ آیت ہے کہ وعد الله الذین آمنوا منکم و عملوا الصالحات لیستخلفنهم فی الارض (النور ۵۵)۔ موجودہ حالات کی روشنی میں اس آیت کی تفسیر کیا ہے۔ میں نے کہا کہ استخلاف بلاشبہ اللہ کا ایک وعدہ ہے۔ مگر خود آیت بتاتی ہے کہ یہ ایک مشروط وعدہ ہے۔ یعنی جب شرط پوری ہوگی اسی وقت وعدہ کی تکمیل ہوگی۔ آیت کے مطابق یہ شرطیں بنیادی طور پر دو ہیں ـــــــ ایمان اور عمل صالح۔ ایمان اور عمل صالح کے بغیر خلافت کے وعدہ کی تکمیل ممکن نہیں۔

اس آیت کے مطابق امت میں اگر ایمان اور عمل صالح موجود ہو تو لازماً اس کو خلافت حاصل ہوگی۔ اسی طرح اس کے برعکس اگر خلافت موجود نہ ہو تو یہ اس کا لازمی ثبوت ہوگا کہ امت کے اندر مطلوب ایمان اور مطلوب عمل صالح موجود نہیں۔ یہ ایک لازم و ملزوم معاملہ ہے۔ اس لئے اگر ایک چیز موجود نہ ہو تو سمجھ لینا چاہئے کہ دوسری چیز موجود نہیں ہے۔

۱۱ بجے جامعۃ الامام ابن تیمیہ کے ہال میں طلبہ و اساتذہ کو خطاب کیا۔ وسیع ہال مکمل طور پر بھرا ہوا تھا۔ قرب و جوار کے لوگ بھی کافی تعداد میں شریک تھے۔ میں نے اپنی تقریر میں دو چیزوں کی اہمیت بتائی۔

ایک علم اور دوسری دعا۔ علم کے ذریعہ آدمی صاحب شعور بنتا ہے اور دعا کے ذریعہ وہ اس برتر طاقت کی نصرت حاصل کرتا ہے جو اس کو ہر جگہ کامیاب کرنے والی ہے۔

میں نے کہا کہ امام ابن تیمیہ سے میں نے ذاتی طور پر یہ دونوں چیزیں سیکھی ہیں۔ ان کے متعلق کہا جاتا ہے کہ جب قرآن کی کسی آیت کے سلسلہ میں ان کو اشکال پیش آتا تو وہ تنہائی میں چلے جاتے اور وضو کر کے دو رکعت نماز پڑھتے اور سجدہ میں سر رکھ کر کہتے: یا معلم ابراهیم علمنی (اے ابراہیم کے معلم، مجھے بھی علم دے دے) یہ دعا کوئی سادہ دعا نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن ایک ایسی کتاب ہے جس کا قاری اس کے مصنف سے ہر لمحہ کنسلٹ کر سکتا ہے، خواہ یہ قاری کسی بھی مقام پر اور کسی بھی زمانہ میں ہو۔ یہ ایک ایسی خوش قسمتی ہے جو قرآن کے قاری کے سوا کسی اور کتاب کے قاری کو حاصل نہیں۔

میں نے اللہ کے فضل سے ابن تیمیہ کے اس طریقہ کو اپنا مستقل طریقہ بنالیا۔ اس سے مجھے غیر معمولی فائدے حاصل ہوئے۔ پھر میں نے کہا کہ ابن تیمیہ کی ایک اور خصوصیت یہ تھی کہ وہ ہر قسم کی چیزیں کثرت سے پڑھتے تھے۔ چنانچہ ان کی کتابیں معلومات کا خزانہ بن گئیں۔ میں نے اپنی زندگی میں اللہ کی توفیق سے ایسا ہی کیا۔ میں نے اپنی تقریباً پوری زندگی مختلف قسم کے علوم کے مطالعہ میں گذار دی۔ یہ مطالعہ میرے لئے بے حد مفید ثابت ہوا۔ اگر آپ کا مطالعہ محدود ہو تو آپ مسائل کی پوری نوعیت کو نہیں سمجھ سکتے۔ اور نہ اس کا گہرا تجزیہ کر سکتے۔ اس لئے آپ کو چاہئے کہ مطالعہ کو زیادہ سے زیادہ بڑھائیں۔ نیز یہ کہ ہر قسم کی چیزیں پڑھیں۔ حقیقت یہ ہے کہ علم کے بغیر انسان کی شخصیت ادھوری رہتی ہے۔

ایک صاحب نے کہا کہ آپ جس تحمل اور ایڈجسٹمنٹ کی تلقین کرتے ہیں وہ ہر آدمی اپنی ذاتی زندگی میں اپنائے ہوئے ہے۔ مگر جب آپ اس طریقِ عمل کو ملی زندگی میں اختیار کرنے کے لئے کہتے ہیں تو یہی لوگ آپ کی مخالفت کرنے لگتے ہیں۔ جس حکمت کو وہ اپنی ذاتی زندگی میں جانتے ہیں، کیا وجہ ہے کہ ملی زندگی کے معاملات میں وہ اس سے بے خبر ہیں۔

میں نے کہا کہ اس کا سبب یہ ہے کہ ذاتی معاملات میں وہ اپنی جبلت (instinct) کے تحت عمل کرتے ہیں۔ لیکن ملی زندگی میں معاملہ شعور کا ہو جاتا ہے جہاں ان کو اپنے شعور کے تحت بالقصد کام کرنا ہے۔ مگر مسلم سماج اور مسلم اداروں نے ان کے اندر یہ شعور زندہ نہیں کیا۔ اس لئے وہ اس کو اجنبی سمجھ کر رد کر دیتے ہیں۔ آپ کا کام یہ ہے کہ اس معاملہ میں ان کے شعور کو جگائیں۔ شعوری بیداری کے بعد اپنے آپ ان کا یہ تضاد ختم ہو جائے گا۔

بتیا کے جناب حیدر علی صاحب (۶۰ سال) اس سفر میں ہمارے ساتھ تھے۔ چند پروگرام میں

شرکت کے بعد میں نے ان سے اس سفر کا تاثر پوچھا۔ انہوں نے اپنے الفاظ میں اپنا تاثر اس طرح ظاہر کیا: میں نے یہ جانا کہ ہمارے تمام مسائل کا حل قرآن میں موجود ہے۔ مجھے جو بھی بات کرنا چاہئے اپنے دین کے حوالہ سے کرنا چاہئے۔ اور اللہ کو حاضر وناظر جان کر کرنا چاہئے۔ اور میں نے پایا کہ ذکر میں جو لذت ہے وہ کسی اور چیز میں نہیں۔ اور ان باتوں کو میں نے الرسالہ کے ذریعہ حاصل کیا ہے۔

جناب حیدر علی صاحب نے کہا کہ یہ ایک تاریخی واقعہ ہے کہ مسلمانوں نے ہندستان میں آٹھ سو سال تک حکومت کی۔ مسلمانوں نے ہندستان کو تاج محل کی خوبصورتی، قطب مینار کی اونچائی اور لال قلعہ کی عظمت دی۔ مسلمانوں کی ان فخریہ باتوں سے ہندوؤں کے جذبات کو ٹھیس پہنچتی ہے تو کیوں؟۔ مسلمانوں نے یہ نمایاں کام کئے ہیں۔ اس پر فخر کرنے میں کیا برائی ہے۔

میں نے کہا کہ جو مسلمان ایسی بات کرتے ہیں ان کو سوچنے کا ایک ہی ڈھنگ معلوم ہے اور وہ قومی ڈھنگ ہے۔ دعوتی سوچ کیا ہوتی ہے اس کی ان کو خبر نہیں۔ قوم پرست انسان اپنی بڑائی میں جیتا ہے اس لئے وہ اپنی بڑائی کو ثابت کرکے خوش ہوتا ہے۔ اس کے برعکس داعی کا معاملہ یہ ہے کہ وہ انسانیت کی خیر خواہی میں جیتا ہے اس کی سوچ خیر خواہانہ سوچ ہوتی ہے، یہی سوچ اس کو مجبور کرتی ہے کہ وہ کوئی ایسی بات نہ کرے جو مدعو کو اس سے دور کرنے والی ہو۔ میں نے کہا کہ کچھ علوم وہ ہیں جو خیر خواہی کی درسگاہ میں پڑھائے جاتے ہیں۔ ان علوم کو وہی حاصل کر سکتا ہے جس نے خیر خواہی کی درسگاہ میں تعلیم حاصل کی ہو، ورنہ وہ ان علوم سے بے بہرہ رہے گا۔

سوڑھنی کے محمد مطلوب عالم مطلوب (۳۸ سال) مرکز تعمیر انسانیت کے نائب صدر ہیں۔ اس کے صدر، جلال الدین سلفی ہیں، جناب ماسٹر اکرام الدین صاحب اس ادارہ کے سکریٹری ہیں، جناب محمد نظام الدین ضیغی اس کے ناظم ہیں۔ یہ لوگ الرسالہ مشن سے پورا اتفاق رکھتے ہیں۔ جناب محمد مطلوب عالم مطلوب نے اپنا تاثر بتاتے ہوئے کہا: "میں جب مولانا صاحب کی کتاب کا مطالعہ کرتا تھا تو میری یہ خواہش ہوتی تھی کہ ان سے ملوں۔ یکم نومبر کی صبح کو پٹنہ ریلوے اسٹیشن پر پہلی بار مولانا صاحب کو دیکھا تو اچانک میری آنکھوں سے آنسو ابل پڑے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ جس طرح ان کی کتابوں میں ایسی چیز ملتی تھی جس کو پہلے میں نے کہیں اور نہیں پڑھا تھا اسی طرح ان کو دیکھ کر یہ محسوس ہوا کہ میں ایک ایسا چہرہ دیکھ رہا ہوں جیسا چہرہ میں نے پہلے کہیں اور نہیں دیکھا تھا۔ سفر کے دوران میں نے دیکھا کہ مولانا صاحب اپنا ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کرتے۔ وہ اپنے ہر لمحہ کا استعمال انسانیت کو پیغام پہنچانے کے لئے کرتے ہیں۔ یہ دو روز جو میں نے مولانا کے ساتھ گزارے ہیں وہ میری زندگی کے قیمتی لمحات تھے"۔

۲ نومبر کی شام کو ہم لوگ موتی ہاری پہنچے۔ ہم لوگوں کا پہلا پڑاؤ ڈاکٹر عبد الرحمٰن صاحب کی رہائش گاہ پر تھا۔ اپنی زندگی کے حالات بتاتے ہوئے انہوں نے کہا کہ میں نے اسکول کا کام ۱۹۴۵ میں شروع کیا۔ اس وقت یہاں ایک روپے میں ایک من دھان ملتا تھا۔ میں نے پوچھا کہ آج یہاں ایک من دھان کی قیمت کیا ہے۔ انہوں نے کہا آج یہاں ایک من دھان کی قیمت ڈیڑھ سو روپے ہے۔ میں نے دوبارہ پوچھا کہ دینی اور ملی ادارہ بنانا ۱۹۴۵ میں زیادہ آسان تھا یا آج زیادہ آسان ہے۔ پھر میں نے کہا کہ واقعات بتاتے ہیں کہ یہ کام پہلے کے مقابلہ میں آج زیادہ آسان ہے۔ چنانچہ آج نہ صرف بہار میں بلکہ سارے ملک میں پہلے سے سو گنا زیادہ دینی اور تعلیمی ادارے قائم ہیں اور ترقی کر رہے ہیں۔

میں نے کہا کہ ماضی اور حال کے اس فرق پر غور کیجئے تو اس سے بہت بڑا سبق معلوم ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ معاشی مسائل یا زمانی تبدیلیاں دین کی راہ میں رکاوٹ نہیں ہیں۔ مسائل خواہ کتنے ہی زیادہ ہوں اور زمانے میں خواہ کتنی ہی تبدیلیاں آجائیں، مگر دین اور ملت کا قافلہ بدستور آگے بڑھتا رہے گا، قیامت سے پہلے اس کے تیز رفتار سفر کو کوئی روکنے والا نہیں۔

مسٹر ارشد شعیب ہاشمی (۳۰ سال) ایک انجینئر ہیں۔ وہ سروس نہیں کرتے۔ وہ خود اپنی فرم چلا رہے ہیں۔ ان سے میری ملاقات ڈاکٹر ایم اے رحمٰن کے مکان پر ہوئی۔ ان سے میں نے پوچھا کہ اپنی زندگی کا کوئی خاص تجربہ بتایئے۔ انہوں نے بتایا کہ تعلیم کی تکمیل کے بعد پہلے میں نے اپنی قوم میں کام شروع کیا۔ مگر مجھے نہایت تلخ تجربے ہوئے۔ اپنے لوگوں کے درمیان کام کرتے ہوئے گھاٹا بھی اٹھانا پڑا۔ اور باتیں بھی سننی پڑیں۔ آخر کار میں نے اپنے کام کا میدان بدل دیا۔ وہ ایک آرکیٹکٹ ہیں۔ وہ بلڈنگ کا نقشہ بھی بناتے ہیں اور تعمیر بھی کراتے ہیں۔ اب وہ زیادہ تر ہندوؤں میں کام کرتے ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ یہاں مجھے بالکل مختلف قسم کا تجربہ ہو رہا ہے۔ یہاں میرے کام کی قدر ہوتی ہے۔ یہ لوگ مجھ پر اعتماد کرتے ہیں۔ مالی لین دین میں وہ قابل اعتماد ثابت ہوتے ہیں۔ مسٹر ارشد شعیب ہاشمی نے کہا کہ ہماری قوم میں ایک عام کمزوری یہ ہے کہ ان میں سے ہر ایک اپنے آپ کو لیڈر سمجھتا ہے۔ کوئی شخص کسی دوسرے کی بات ماننے کو تیار نہیں۔

مولانا عبد الرحیم امدادی صاحب نے اس علاقہ میں مسلسل دورہ کر کے یہاں الرسالہ مشن کا ماحول بنایا ہے۔ انہوں نے کہا کہ میرے پاس وسائل کے نام سے کوئی چیز نہ تھی۔ اس کے باوجود میں دیوانہ وار الرسالہ کے لئے گھومتا رہا۔ نہ صرف بھوک پیاس کو بلکہ ہر قسم کی تکلیفوں کو مجھے سہنا پڑا۔ آخر کار ایک وقت آیا جب کہ میرے لئے دروازے کھل گئے اور پورے علاقہ میں ساتھیوں اور مددگاروں کی ایک فوج مجھے

حاصل ہو گئی۔ اپنا تجربہ بتاتے ہوئے انہوں نے کہا کہ دین کے کام میں اللہ کی مدد ضرور آتی ہے مگر وہ اس وقت آتی ہے جب کہ آدمی کے اوپر سو میں سے ننانوے مرحلے گزر چکے ہوں۔ اللہ کی مدد سوویں مرحلہ پر آتی ہے، اس سے پہلے نہیں۔

۳ نومبر کی صبح کو ہم لوگ ڈاکٹر اے رحمٰن موڈل اکیڈمی دیکھنے کے لئے گئے۔ مسٹر سہیل اختر اس کے پرنسپل ہیں۔ وسیع اور شاداب کیمپس میں ایک خوبصورت زیر تعمیر مسجد ابھر رہی ہے جو میرے جیسے آدمی کے لئے خاص طور پر جاذب نظر ہے۔ اس رحمٰن اکیڈمی "اسکول" کی ایک خاص صفت یہ ہے کہ یہاں ہندو مسلم کی کوئی تفریق نہیں۔ یہاں مسلم بچوں کے ساتھ ہندو بچے بھی تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ مزید یہ کہ اس اسکول میں اردو زبان لازمی ہے اور ہندو بچے بھی شوق کے ساتھ اردو پڑھتے ہیں۔ ان کے والدین اس پر نہایت خوش ہیں۔ یہاں پڑھنے والے ہندو بچوں کی تعداد اس وقت تقریباً پچاس ہے۔

میں نے کہا کہ آپ کا یہ تعلیمی ادارہ وہ کام کر رہا ہے جو قومی یکجہتی (نیشنل انٹگریشن) کے معاملہ میں بہت اہم ہے۔ یعنی مشترک زبان۔ جس ملک کی قومی زبان ایک ہو، وہاں قومی یکجہتی اپنے آپ قائم ہو جاتی ہے، جیسے جاپان۔ جاپانیوں کی زبان ایک ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جاپان میں کسی مزید کوشش کے بغیر قومی یکجہتی اپنے آپ قائم ہے۔

ڈاکٹر اے رحمٰن اس تعلیمی اکیڈمی کے فاؤنڈر ہیں۔ ۲ نومبر کی شام کو یہاں ایک جلسہ ہوا جس میں بڑی تعداد میں لوگ جمع ہوئے۔ میں نے اپنی تقریر میں بتایا کہ قرآن و حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ دنیا کا نظام اللہ نے اس طرح بنایا ہے کہ ایک عسر پیدا ہوتا ہے تو عین اسی وقت دو یسر سامنے آجاتے ہیں۔ اگر ایک مسئلہ پیدا ہوتا ہے تو دگنا تعداد میں اس کے حل کے دروازے کھل جاتے ہیں۔ اس حقیقت کو حدیث میں اس طرح بیان کیا گیا ہے: لن یغلب عسر یسرین۔

اس حدیث میں جو بات کہی گئی ہے وہ کوئی پراسرار بات نہیں، وہ فطرت کا ایک قانون ہے۔ ہر آدمی اپنے ذاتی تجربہ سے اس کو سمجھ سکتا ہے۔ اگر آپ راستہ چل رہے ہوں اور کوئی خطرہ پیش آجائے تو آپ دگنا طاقت سے دوڑنے لگتے ہیں۔ اگر آپ کو کوئی مسئلہ پیش آجائے تو آپ دگنا محنت کرنے لگتے ہیں تاکہ زیادہ محنت کے ذریعہ اپنے مسئلہ کو حل کر سکیں۔ یہ معاملہ فرد کے ساتھ بھی پیش آتا ہے اور قوم کے ساتھ بھی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب کوئی مشکل سامنے آتی ہے تو آدمی کا دماغ زیادہ متحرک ہو جاتا ہے۔ اس کی چھپی ہوئی قوتیں بیدار ہو جاتی ہیں۔ وہ اپنی عام طاقت سے زیادہ عمل کر کے ایک غیر معمولی انسان بن جاتا ہے۔

میں نے کہا کہ مسلمانوں میں جو اصل کمی ہے وہ یہ ہے کہ ان کے درمیان تھنکنگ پراسس (thinking process) رک گیا ہے۔ آج مسلمانوں کی تعداد ایک بلین سے زیادہ ہے۔ ان کے پاس پٹرول کی صورت میں دولت کے خزانے ہیں۔ تقریباً ساٹھ ملکوں میں ان کا سیاسی اقتدار قائم ہے، وغیرہ وغیرہ۔ اس کے باوجود وہ ساری دنیا میں بے قیمت ہو رہے ہیں۔ اس کی واحد وجہ یہی ہے کہ مسلمانوں میں سب کچھ ہے مگر ایک بنیادی چیز ان کے درمیان مفقود ہو گئی ہے۔ اور وہ ہے سوچنے کا عمل (تھنکنگ پراسس)۔

ڈاکٹر اے رحمٰن موڈل اکیڈمی کے جلسہ کے بعد اخبار کے کئی نمائندے آگئے۔ انہوں نے انٹرویو لیا۔ ایک اخبار نویس نے پوچھا کہ آپ کا تعلق کس جماعت سے ہے۔ میں نے کہا کہ میرا تعلق امت مسلمہ سے ہے۔ پوری امت مسلمہ میری جماعت ہے۔ مذکورہ اخبار نویس نے کچھ دیر کے بعد میرے کہنے پر اپنے لکھے ہوئے کو دہرایا تو معلوم ہوا کہ انہوں نے میرا جواب اس طرح لکھا تھا: میں پوری امت مسلمہ کا رہبر ہوں۔ میں ان کے اس لکھنے پر سخت حیران ہوا۔ میں نے کہا کہ آپ لوگوں کی غلط رپورٹنگ ہی موجودہ زمانہ کا سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ میں نے آپ کے سوال کے جواب میں یہ کہا تھا کہ میرا تعلق پوری امت مسلمہ سے ہے۔ اور آپ نے اس کو ان الفاظ میں لکھا کہ میں پوری امت مسلمہ کا رہبر ہوں۔ یہ ایک چھوٹی سی مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اخبار کی رپورٹنگ میں کس طرح بات بدل جاتی ہے۔

ایک اخباری نمائندہ نے سوال کیا کہ آپ کے بارے میں طرح طرح کے الزام لگائے جاتے ہیں۔ مثلاً آپ آر ایس ایس کے آدمی ہیں۔ ان الزامات کے بارے میں آپ کا کیا جواب ہے۔ میں نے کہا کہ اس قسم کے الزامات صرف مجھ سے خاص نہیں ہیں۔ جب بھی کوئی آدمی کام کرنے کے لئے اٹھتا ہے تو لوگ اس کو اسی طرح اپنے الزامات کا شکار بناتے ہیں۔ مثلاً سر سید، اقبال، مولانا حسین احمد مدنی، ابوالکلام آزاد، مولانا علی میاں، وغیرہ۔ ان میں سے کوئی بھی شخص اس قسم کے الزامات سے بچا ہوا نہیں، حتی کہ تبلیغی جماعت جو ایک بے ضرر جماعت ہے اس پر بھی بڑے بڑے الزامات لگائے گئے۔ مثلاً یہ کہ وہ سی آئی اے کے ایجنٹ ہیں، وہ مسلمانوں کو عمل کے میدان سے ہٹانے کی سازش کر رہے ہیں۔ وہ مسلمانوں میں غلط دین پھیلا رہے ہیں، وغیرہ۔

محمد ثناء اللہ ندوی شریک سفر تھے۔ ان سے پوچھا گیا کہ آپ نے الرسالہ کی تحریریں پڑھی ہیں اور اب صاحب الرسالہ کے ساتھ سفر میں نکلے ہیں اس بارہ میں اپنا تاثر بتایئے۔ ان کا جواب ان الفاظ میں تھا: "میں نے بہت سارے مصنفین کی کتابیں پڑھی ہیں، لیکن مولانا وحید الدین کی تصانیف، ان کا الرسالہ، بالخصوص ان کی چند روزہ صحبت نے میرے اندرون میں، میری فکر میں اور میرے جذبہ دعوت میں

انقلاب پیدا کر دیا۔ میں مولانا کو اس دور کا عظیم مفکر، حقیقی داعی، خادمِ قوم وملت مانتا ہوں اور ان کے مشن سے مکمل اتفاق رکھتا ہوں۔"

جناب ایم ٹی خان (۵۲ سال) بہار کے سفر میں ساتھ تھے۔ سفر کے بارے میں ان کے تاثرات دریافت کئے گئے تو ان کا جواب ان الفاظ میں تھا: "مولانا سے ملنے اور سننے کے بعد ہم لوگوں نے یہ محسوس کیا کہ زندگی میں بہتری لانے کے لئے مولانا کی کتابوں کو پڑھنا اور زندگی میں اصلاح کرنا ضروری ہے۔ لوگوں نے اس بات کو محسوس کیا کہ الرسالہ مشن ہی سے ان کو تعمیری حل مل سکتا ہے۔ کئی لوگ جو سننے سے پہلے سخت تنقیدی انداز اختیار کئے ہوئے تھے، سننے کے بعد ان کا وہ انداز باقی نہ رہا۔ تاہم انہوں نے اعتراف کیا کہ صاحب الرسالہ کے ساتھ سفر کرنے کے بعد میرا ایک احساس یہ ہوا کہ اس مشن کی گہرائی کو صرف کچھ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہی سمجھ سکتے ہیں، عوام نہ اس کو سمجھ سکتے ہیں اور نہ اختیار کرسکتے ہیں"۔

ڈاکٹر اے رحمٰن ماڈل اکیڈمی میں جو لوگ شریک ہوئے ان میں سے ایک سینئر وکیل مسٹر اے ایم کیفی تھے۔ انہوں نے تقریر سننے کے بعد ایم ٹی خان سے کہا: "مجھے مولانا کے بارے میں صرف اخبار میں کنٹر ودر شیل آرٹکل پڑھنے کو ملے تھے لیکن اب سننے کے بعد مجھے یہ محسوس ہوا کہ مولانا تو صرف صحت مند فکر اور مثبت سوچ کی بات کرتے ہیں۔"

جناب ایم ٹی خان صاحب کے متعلق مشہور ہے کہ ان کو غصہ نہیں آتا۔ ان سے گفتگو کے بعد اندازہ ہوا کہ اس کا سبب یہ نہیں ہے کہ غصہ کی صفت ان کے اندر سرے سے موجود ہی نہیں۔ انہوں نے کہا کہ میں نے ایک تکنیک دریافت کی ہے اور جب بھی کسی کی کوئی ایسی بات سامنے آتی ہے جو غصہ دلانے والی ہو تو میں اس تکنیک کو استعمال کرکے اپنے آپ کو غصہ سے بچالیتا ہوں۔ انہوں نے بتایا کہ وہ تکنیک یہ ہے کہ جب دوسرا شخص غصہ میں آکر اشتعال انگیز بات کرتا ہے تو میں سوچنے لگتا ہوں کہ میں اس کی سطح پر کیوں جاؤں۔ یہ احساس مجھے اپنی سطح کو برقرار رکھنے میں مددگار بن جاتا ہے۔

میں نے ایک صاحب سے کہا کہ زندگی ایک امتحان ہے انہوں نے کہا کہ ہاں۔ پھر میں نے سوال کیا کہ یہ مشکل امتحان ہے یا آسان امتحان۔ انہوں نے کہا کہ بہت مشکل امتحان ہے۔ میں نے کہا آپ نے ٹھیک کہا۔ زندگی بلاشبہ ایک سخت مشکل امتحان ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ہر انسان اپنے مزاج کے اعتبار سے کسی حد بندی کے بغیر جینا چاہتا ہے، وہ چاہتا ہے کہ میرے اوپر کوئی پابندی نہ ہو، میں جو چاہوں کروں اور جو چاہوں نہ کروں۔ مگر دنیا کی زندگی میں ایک چیز اس کی خواہش کے خلاف ہمیشہ روک بنی رہتی ہے۔ وہ یہ کہ اس کو ایک ایسی دنیا میں جینا پڑتا ہے جس کے خود اپنے مستقل قوانین ہیں۔ انسان ان قوانین کو بدل نہیں

سکتا۔ وہ مجبور ہے کہ وہ کسی تبدیلی کے بغیر ان کو مان لے۔ دنیا میں صرف پابند زندگی ممکن ہے، آزاد زندگی یہاں سرے سے قابل عمل ہی نہیں۔

جناب نجم الدین ہاشمی صاحب جنرل سکریٹری انجمن اسلامیہ موتی ہاری ۲ نومبر کو شام کے پروگرام میں موجود تھے۔ انہوں نے کہا کہ میں آپ کی ایک بات کی وضاحت چاہتا ہوں۔ آپ نے تقریر میں کہا تھا کہ دنیا میں کامیابی کے لئے ضروری ہے کہ اپنی منفی سوچ کو مثبت سوچ میں بدلا جائے۔ یہ کام کس طرح ہوگا۔ میں نے کہا کہ یہ کام تو ہر آدمی ہر روز کرتا ہے۔ اور اگر وہ ایسا نہ کرے تو موجودہ دنیا میں وہ زندہ ہی نہیں رہ سکتا۔ فرق صرف یہ ہے کہ عام لوگ وہاں اپنی مثبت سوچ بناتے ہیں جہاں ان کا ذاتی انٹرسٹ زد میں آرہا ہو۔ مومن وہ ہے جو اصول کی بنیاد پر، نہ کہ ذاتی انٹرسٹ کی بنیاد پر اپنی منفی سوچ کو مثبت سوچ بنالے۔

ایک صاحب نے کہا کہ وہ مستقل طور پر ٹینشن میں رہتے ہیں۔ اس کا سبب انہوں نے یہ بتایا کہ ان کا خاندان مشترک خاندان ہے۔ میں نے کہا کہ مشترک خاندان ٹینشن سے خالی نہیں ہوسکتا۔ حتی کہ صالح لوگوں کے لئے بھی نہیں۔ پھر میں نے کہا کہ آدمی کے لئے دنیا میں ہمیشہ دو میں سے ایک کا انتخاب رہتا ہے مگر آدمی تیسرا انتخاب لیتا ہے جو ممکن نہیں۔ اسی راز کو جاننے کا نام کامیابی ہے اور اسی راز کو نہ جاننے کا نام ناکامی۔

میں نے کہا کہ آپ کے لئے دو میں سے ایک کا انتخاب ہے۔ اگر آپ مشترک مکان میں رہنا چاہتے ہیں تو آپ پریکٹکل اپروچ اختیار کرتے ہوئے اپنے کو آخری حد تک بے شکایت بنالیں۔ دوسرا انتخاب یہ ہے کہ آپ مشترک مکان کو چھوڑ دیں اور اپنے لئے ایک الگ مکان حاصل کریں۔ آپ نے ان دو کے بجائے تیسرا انتخاب لے رکھا ہے۔ یعنی آپ چاہتے ہیں کہ آپ ایک مشترک خاندان میں رہیں مگر آپ کے لئے کسی کی طرف سے کوئی مسئلہ پیدا نہ ہو۔ یہ تیسرا انتخاب ہے۔ اور اس طرح کے معاملہ میں تیسرا انتخاب ممکن ہی نہیں۔

جناب ڈاکٹر سہیل اختر صاحب علیگ ۲ نومبر کو شام کے جلسہ میں موجود تھے۔ انہوں نے میری اس تقریر کے بارے میں سوال کیا کہ آپ نے اپنی تقریر میں کہا تھا کہ مسلمانوں کے اندر سے مایوسی اور شکایت کو دور کرنا ہمارا مشن ہے۔ یہ مایوسی اور شکایت مسلمانوں کے اندر سے کیسے نکلے گی۔ دوسرا سوال یہ ہے کہ صبر کا اسلامی تصور کیا ہے۔ میں نے کہا کہ مایوسی اور شکایت کو ختم کرنے کا نسخہ اسلام کے مطابق قناعت ہے۔ قناعت کے لفظ کو عام طور پر بہت محدود مفہوم میں لیا جاتا ہے۔

مگر حقیقت یہ ہے کہ قناعت ایک صحت مند مزاج ہے جس کا تعلق پوری زندگی سے ہے۔ قناعت

کا مطلب یہ ہے کہ جو کچھ ملا ہوا ہے اس پر راضی رہتے ہوئے اپنے عمل کا نقشہ بنانا۔ وہ چیز جس کو مایوسی اور شکایت کہا جاتا ہے وہ ہمیشہ عدم قناعت کا نتیجہ ہوتی ہے۔ یعنی ملے ہوئے پر راضی نہ ہونا اور نہ ملے ہوئے پر اپنی نظریں جمائے رکھنا۔ جہاں تک صبر کا تعلق ہے تو صبر اسلام میں صرف ایک طریق عمل نہیں، بلکہ وہ ایک عبادت ہے۔ اسلامی صبر یہ ہے کہ حالات خواہ کتنے ہی ناخوش گوار ہوں، آپ اپنے آپ کو منفی سوچ سے بچائیں اور غیر متاثر سوچ کے تحت اپنے عمل کا نقشہ بنائیں۔

آزادی سے پہلے کے ہندستان میں یہ عام رواج تھا کہ مسلمانوں کے تعلیمی اداروں میں ہندو نوجوان بھی پڑھا کرتے تھے۔ یہ روایت اب بھی بہار میں کسی قدر باقی ہے۔ اس سلسلہ میں ایک دلچسپ مثال ٹائمس آف انڈیا کے پٹنہ ایڈیشن (۹ ستمبر ۲۰۰۰) میں شائع ہوئی ہے۔ یہ واقعہ مزید تفصیل کے ساتھ ٹائمس آف انڈیا کے نئی دہلی ایڈیشن (۱۲ ستمبر ۲۰۰۰) میں چھپا ہے۔ اس رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ بہار کے ضلع گوپال گنج (کھیتا پور) میں ایک مسلم مدرسہ قائم ہے جس میں ۴۰۰ طلبہ تعلیم حاصل کر رہے ہیں ان میں سے ۷۰ ہندو طلبہ ہیں۔ ایک سابق ہندو ایم ایل اے نے بھی اپنے بچے کو اس مدرسہ میں داخل کرلیا ہے۔ ٹائمس آف انڈیا کی یہ رپورٹ اگلے صفحہ پر نقل کی جارہی ہے۔

جناب مولانا محمد مطلوب (گیا) اور محمد اکرام الدین صاحبان اس سفر میں ہمارے ساتھ تھے۔ انہوں نے کہا کہ جب ہم کو الرسالہ نہیں ملا تھا تو ہمارا حال یہ تھا کہ ہمارے سینہ میں دوسروں کے خلاف نفرت کی آگ بھڑکتی رہتی تھی۔ میرے غصہ کا حال یہ تھا کہ اگر کوئی مجھے ایک گالی دے تو میں اسے دس گالی دوں اگر کوئی مجھے ایک ڈنڈا مارے تو میں اس کو دس ڈنڈے ماروں۔ اسی کو میں اپنے لئے کمال سمجھتا تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ یہی بہادری ہے اور ایسا نہ کرنا بزدلی۔ مگر الرسالہ کے مطالعہ سے میرے سینہ میں حسد وانتقام کی بھڑکتی ہوئی آگ بجھ گئی۔ مجھے یہ تجربہ ہوا کہ زندگی دوسروں سے محبت کرنے کا نام ہے نہ کہ ان سے نفرت کرنے کا نام۔

۳ نومبر کو ہم لوگ مدرسہ حسینیہ بیلواڑہ پہنچے۔ یہاں لوگوں سے ملاقات ہوئی۔ یہ مدرسہ اس علاقہ میں تعلیم پھیلانے کا کام کر رہا ہے۔ مدرسہ کے پرامن تعلیمی ماحول کو دیکھ کر خوشی ہوئی۔ لوگوں سے بات کرتے ہوئے میں نے کہا کہ تعلیم ہی احیاء ملت کے کام کا آغاز ہے۔ جب تک تعلیم لوگوں کے اندر عام نہ ہو جائے، دوسرا کوئی بھی کام نہیں کیا جاسکتا۔ قوم کو تعلیم یافتہ بنائے بغیر دوسرے دوسرے ایشو پر لوگوں کو اٹھانے کی کوشش کرنا صرف شخصی مقبولیت کا ذریعہ ہے، وہ ملت کی تعمیر کا ذریعہ نہیں۔

جناب عبد المجید صاحب (۷۰ سال) بتیا کی ایک خاص شخصیت ہیں۔ انہوں نے اپنی زندگی کے کئی واقعات بتائے۔ ۱۹۴۲ میں وہ ندوہ میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ جب کوئٹ انڈیا کی تحریک شروع ہوئی تو

HINDUS STUDYING IN MADRASA

PATNA: There were a few lessons the maulana still had to learn. On an annual visit to a local madrasa in the backwaters of Bihar, the maulana from UP was surprised to see two Hindu boys, aged three and five, attired in a *topi,* reading Urdu prescribed for the students of the minority community. "When he learnt their names, he wanted to meet me," exults their grandfather Vidya Bhusan Singh.

A strange lesson for the maulana, yes. But for Singh, there seems to be nothing amiss in his decision. The ex-MLA has been sending his two grandsons to the local *Madrasa* instead of the village primary school in Gopalganj district for a long time now.

Initially, there was a hue and cry in the Rajput community from which he hails in Meera Tola-Khetapur village of Gopalganj's Baikunthpur block. "We had to face relentless taunts from the villagers. They even said we were converting to Islam," the ex-MLA who is currently general secretary of the state Samajwadi Party told *The Times of India.*

But that was then. Today, Singh's experiments have borne fruit and there has been a sea change in the attitude of the villagers. "Today, about 70 children belonging to the Hindu community study in the same *madrasa* which has a total strength of about 400. The head Maulvi did not object to Hindu children studying in the *madrasa,*" he said.

But why did he send his grandsons to the *madrasa* for primary education? Only because the village government primary school was virtually defunct, Singh pointed out. "The primary school has two teachers. Each draws a fat salary of over Rs 10,000 per month. But the two are always absent. On the other hand, the madrasa is efficiently run by the head maulvi and his two assistants."

Singh does not think that sending his grandsons to the *madrasa* intrudes on his religion. "On the contrary, they will have a better perception of their own and other's religion," he stressed pointing out that the *madrasa* in his village must be the only one in the state in which so many Hindu children study.

Interestingly, this has been a learning experience for the grandfather too. "I have tried to learn the Urdu script from my grandsons since I was never able to learn the language," he said.

Reported by Dipak Mishra, *The Times of India*, New Delhi, September 12, 2000

پر جوش لوگوں نے ریل کی پٹریاں اکھاڑ دیں۔ ٹرینوں کی آمد و رفت رک گئی۔ انہوں نے بتایا کہ میں اور چند دوسرے طلباء لکھنؤ سے پیدل چل کر بتیا پہنچے، اس سفر میں تقریباً ایک ماہ لگ گیا۔ انہوں نے بتایا کہ سفر کے دوران جس گاؤں میں بھی ہم لوگ پہنچے وہاں ہم لوگ عزت کے ساتھ ٹھہرائے گئے۔ وہ لوگ کھانے پینے کا انتظام کرتے اور کئی کئی دن تک روکتے۔ اسی بنا پر یہ سفر اتنا لمبا ہو گیا۔

مدرسہ حسینیہ سے چل کر جناب سید عبدالمجید صاحب کے مکان پر پہنچے۔ یہاں بہت سے تعلیم یافتہ لوگ اکٹھا ہو گئے۔ ان میں ہندو بھی تھے اور مسلمان بھی۔ ان لوگوں سے دیر تک باتیں ہوئیں۔ ان میں ایک عجیب شخصیت ڈاکٹر اشونی کمار اشرف (۴۵ سال) تھی۔ وہ ایم جے کالج میں صدر شعبہ فلسفہ ہیں۔ وہ چھوٹی عمر میں تھے کہ ان کی دونوں آنکھیں ضائع ہو گئیں۔ پوری تعلیم انہوں نے بریل سسٹم کے ذریعہ حاصل کی۔ وہ شاعر بھی ہیں۔ انہوں نے اپنی ایک نعت سنائی جو رلا دینے والی تھی۔ اس کا ایک شعر یہ تھا:

کس کے در پہ جائیے کس سے لو لگائیے　　　اک یہی ہے آستاں سید کون و مکاں

ڈاکٹر اشونی کمار اشرف جیسے لوگ قدرت کا ایک معجزہ ہیں۔ آنکھ سے معذور ہونے کے باوجود وہ تقریباً دس زبانوں پر قدرت رکھتے ہیں۔ یہ ساری زبانیں انہوں نے بریل سسٹم سے سیکھی ہیں۔ انہوں نے قرآن کی کچھ آیتیں سنائیں تو میری زبان سے نکلا اتنا اچھا تو میں بھی نہیں پڑھ سکتا۔ بریل سسٹم پر انگلیاں پھیرتے ہوئے کبھی وہ قرآن پڑھتے، کبھی انگریزی نظم سناتے، کبھی ہندی اور کبھی اردو عبارتیں دہراتے۔ میں حیرانی کے ساتھ اس منظر کو دیکھتا رہا۔ میں نے سوچا کہ انسان کے اندر کیسی عجیب و غریب صلاحیت ہے کہ وہ آنکھوں سے معذور ہونے کے باوجود پڑھ سکتا ہے۔ وہ لوگ انسانیت کے کتنے بڑے محسن ہیں جنہوں نے آدمی کے اس فطری امکان کو دریافت کیا اور اس کو بریل سسٹم میں ڈھال کر نابینا لوگوں کو موقع دیا کہ وہ اپنی انگلیوں کے ذریعہ وہ کام کریں جو بینا لوگ اپنی آنکھوں کے ذریعہ کرتے ہیں۔

ڈاکٹر اشونی کمار نے مختلف زبانوں میں اہل زبان کے لہجہ میں بہت سے اشعار سنائے۔ یہ میرے لئے ایک انوکھا تجربہ تھا۔ اس کو سن کر میں نے کہا کہ آپ کو دیکھنے کے بعد ایسا محسوس ہوتا ہے کہ لوگوں کو شاید اس پرانے مقولہ پر نظر ثانی کرنی پڑے کہ: جیک آف آل، ماسٹر آف نن۔ آپ نے یہ ثابت کر دیا کہ ایک انسان بیک وقت کئی چیزوں کا ماسٹر ہو سکتا ہے۔ انسان کی استعداد (capacity) اتنی زیادہ ہے کہ اس قسم کا کوئی قول انسانی استعداد کی حد بندی نہیں کر سکتا۔ جناب گیا شنکر سنگھ ایڈوکیٹ اپنے قانونی پیشہ کے ساتھ تعمیری کام بھی کرتے رہتے ہیں۔ اس سلسلہ میں وہ ایک ہندی پرچہ نکالتے ہیں جس کا نام بامعنی طور پر تال میل ہے۔ اس میں اصلاحی تحریریں بھی شائع کی جاتی ہیں۔

سید عبدالمجید صاحب کی زندگی میں ایک انوکھی مثال یہ ملی کہ ان کی بہو نوشابہ صاحبہ ایم اے جب شادی کے بعد ان کے یہاں آئیں تو انہوں نے اپنی بہو سے پوچھا کہ ہم تمہاری خوشی کے لئے کیا کرسکتے ہیں؟ خاتون نے کہا کہ مجھے تو آپ صرف ایک اسکول بنا کر دیدیجئے۔ چنانچہ سید عبدالمجید صاحب نے ایک اسکول تعمیر کر کے انہیں دیا تاکہ وہ قوم کے بچوں کو تعلیم یافتہ بنائیں۔ اس اسکول کا نام سن رائز اکیڈمی ہے۔ ۳ نومبر کی دوپہر کو میں نے خود اپنی آنکھوں سے اس اسکول کو دیکھا۔ یہ بلاشبہ ایک ایسی مثال ہے جس پر ہر ایک کو عمل کرنا چاہئے۔

بہار کے موجودہ سفر میں اس قسم کے بہت سے تعمیری تجربے و مشاہدے سامنے آئے۔ اس کے بعد میری زبان سے نکلا: میڈیا کے ذریعہ بہار کی جو تصویر دنیا کو معلوم ہے وہ صرف یہ ہے کہ یہاں ایک بے پڑھی لکھی خاتون چیف منسٹر ہیں۔ مگر ذاتی مشاہدے کے بعد بہار کی جو تصویر میرے سامنے آئی وہ اس سے مختلف تھی۔ میں نے کہا کہ بہار تو بہارِ علم ہے، اگرچہ لوگ بہار کے اس دوسرے رخ کو بہت کم جانتے ہیں۔

اخباروں کی رپورٹوں کے مطابق بہار کی جو تصویر سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ بہار ایک ایسی ریاست ہے جہاں بے پڑھی لکھی خاتون کو چیف منسٹر بنادیا جاتا ہے، جہاں نیچی ذات اور اونچی ذات کے لوگ ایک دوسرے کو قتل کرتے رہتے ہیں، جہاں سڑکوں کے نام سے صرف غیر ہموار راستے ہیں، جہاں بجلی کا نظام اتنا خراب ہے کہ بجلی ہونے کے باوجود لوگوں کو لالٹین جلانی پڑتی ہے، وغیرہ وغیرہ۔

مگر یہ ریاست بہار کا صرف ایک رخ ہے۔ اس کا دوسرا رخ جو میرے نزدیک زیادہ اہم ہے وہ مجھے میڈیا یا اخباروں کے ذریعہ معلوم نہیں ہوا تھا اس کا علم مجھے صرف اس وقت ہوا جب میں نے اس کا تفصیلی دورہ کیا۔ وہ روشن رخ یہ ہے کہ بہار کے لوگ، ہندو اور مسلمان دونوں، ملک کی تقریباً ۳۰ ریاستوں میں ایک استثنائی حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ سادگی اور تواضع اور اعتراف کے معاملہ میں ممتاز طور پر دوسری ریاستوں سے فائق ہیں۔ ان میں سچائی کو قبول کرنے کا جو مادہ ہے وہ مجھے دوسری ریاستوں میں کم نظر آیا۔

اس کے کئی واضح نمونے مجھے اپنے سفر میں ملے۔ مثلاً میں اپنی عادت کے مطابق لوگوں کو اکثر "تنبیہ" کرتا رہتا تھا مگر وہ لوگ ہمیشہ صرف مخلصانہ مسکراہٹ کی صورت میں اس کا جواب دیتے تھے۔

اسلامی مرکز کی مطبوعات کا اسٹال ہر اجتماع کے موقع پر رکھا گیا تھا۔ مولانا عبدالرحیم امدادی کے الفاظ میں، یہاں ہر جگہ لوگ کتابوں کو جیسے لوٹ رہے تھے، مفت میں نہیں بلکہ پوری قیمت ادا کر کے۔ حتی کہ کتابیں میرے دورہ کی تکمیل سے پہلے ہی ختم ہوگئیں۔

اسی طرح بہار میں ایک انوکھا منظر یہ دیکھنے میں آیا کہ جہاں جہاں میرے خطاب کا پروگرام رکھا گیا،

صرف ایک آدمی کی تقریر سننے کے لئے ہندو اور مسلمان دونوں ہزاروں کی تعداد میں ٹوٹ پڑتے تھے اور لوگوں کا بیان یہ ہے کہ آپ کی تقریر کے پورے دوران لوگوں کا وہ حال ہوتا تھا جس کو اردو میں سانس روک کر سننا اور انگریزی میں پن ڈراپ سائلنس (pindrop silence) کہا جاتا ہے۔ سیاسی لیڈروں کی تقریروں میں بھی بھیڑ ہوتی ہے مگر وہ شور و غل کی بھیڑ ہوتی ہے، جب کہ میری تقریر کے دوران پورے مجمع پر انتہائی خاموشی کا عالم چھایا رہتا تھا۔ مقرر کی آواز کے سوا کوئی اور آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔

۳ نومبر کو جمعہ کا دن تھا۔ بتیا کی جنگی مسجد میں جمعہ کی نماز پڑھی۔ وسیع مسجد مکمل طور پر بھری ہوئی تھی۔ یہاں جمعہ سے پہلے آدھ گھنٹہ میں نے خطاب کیا۔ اس خطاب کے لئے میں نے ایک حدیث کا انتخاب کیا۔ وہ یہ کہ المساجد بیوت المتقین (مسجدیں متقیوں کا گھر ہیں)۔ میں نے بتایا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ مسجد تقویٰ کی تربیت کا مرکز ہے۔ مسجد کے اعمال ان صفات کو پیدا کرنے کا ذریعہ ہیں جو اللہ کو اپنے بندوں سے مطلوب ہیں۔ اذان سے لے کر السلام علیکم ورحمۃ اللہ تک، اور باجماعت نماز کی ادائیگی تک نماز کا ہر جزء متقیانہ زندگی کی تیاری ہے۔ نماز جمعہ کے بعد مولانا علی احمد ندوی (۸۲ سال) کی رہائش گاہ پر ہم لوگ اکٹھا ہوئے۔ دوپہر کا کھانا یہیں کھایا گیا۔

مولانا علی احمد ندوی ۱۹۳۹ء میں دار العلوم ندوۃ العلماء میں داخل ہوئے تھے۔ انہوں نے قدیم ندوہ کو دیکھا ہے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ ۱۹۳۹ کے ندوہ اور آج کے ندوہ میں کیا فرق ہے۔ انہوں نے کہا کہ پہلے ندوہ میں تقریباً ۵۰۰ طلبا کی تعداد ہوتی تھی۔ عمارتیں بھی بہت کم تھیں۔ لیکن اب میں جب ندوہ گیا تو میں نے دیکھا کہ وہاں بہت زیادہ ترقی ہو چکی ہے۔ اب طلبا کی تعداد تین ہزار سے زیادہ ہے۔ کثرت سے عمارتیں بن گئی ہیں۔ بہت سے نئے نئے شعبے کھل گئے ہیں جو شاندار عمارتوں میں قائم ہیں۔ قدیم ندوہ کے مقابلہ میں آج کا ندوہ کم از کم دس گنا زیادہ ترقی کر چکا ہے۔

میں نے سوچا کہ ۱۹۴۷ کے بعد مسلمانوں کے تمام لکھنے والے اور بولنے والے ایک ہی پیغام مسلمانوں کو دے رہے تھے۔ اور وہ یہ کہ اس ملک میں مسلمانوں کے لئے دوسرا اسپین بنایا جا رہا ہے، یہاں ان کی شناخت مٹائی جا رہی ہے، وغیرہ۔ مگر عملاً صورت حال اس کے بالکل برعکس تھی۔ سب سے عجیب بات یہ ہے کہ تقسیم سے پہلے اس وقت کے لیڈروں نے مسلمانوں کو یہ خبر دی تھی کہ غیر منقسم ہندستان میں ان کا کوئی مستقبل نہ ہوگا۔ لیکن واقعات بتاتے ہیں کہ تقسیم کے باوجود ہندستان کے مسلمان تقریباً ہر اعتبار سے پاکستان سے زیادہ بہتر ہیں حتی کہ مسجد اور مدرسہ کے اعتبار سے بھی۔

بتیا میں جناب شاہد جلیل بخشی (۴۰ سال) سے ملاقات ہوئی۔ ان کا وطن بہار شریف ہے۔ وہ اس حادثہ

کے وقت، وہیں تھے جو بہار شریف میں ۹ر اکتوبر ۲۰۰۰ کو ہوا۔ انہوں نے بتایا کہ بہار شریف (امیر محلہ) میں صغری اسٹیٹ وقف کی خالی زمین ہے۔ اس زمین پر قبضہ کرنے کے لئے کچھ ہندوؤں نے یہ تدبیر کی کہ ۸ اکتوبر اور ۹ اکتوبر کی درمیانی شب کو درگا دیوی کی ایک مورتی سنگ مرمر کی بنی ہوئی لائے تاکہ وہاں نصب کریں۔ منصوبہ کا علم مسلمانوں کو ہو گیا تھا۔ مسلمانوں نے یہ نہیں کیا کہ اس مقام پر جاکر خود سے مسئلہ کو حل کرنے کی کوشش کریں۔ اس کے برعکس انہوں نے یہ کیا کہ ضلع انتظامیہ کے افسران اعلیٰ سے مل کر ان سے کہا کہ یہاں ناجائز قبضہ کیا جارہا ہے، آپ لوگ اس کو روکیں۔

ضلع انتظامیہ نے کوئی مؤثر کارروائی نہیں کی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مورتی وہاں نصب ہو گئی۔ مقامی مسلمانوں نے اس اشتعال انگیز کارروائی کے باوجود خود کوئی مداخلت نہیں کی بلکہ مقامی ایم ایل اے کے ذریعہ لالو یادو اور رابڑی دیوی سے ربط قائم کیا اور ملاقات کر کے ان سے ساری صورت حال بیان کی۔

انہوں نے بتایا کہ چیف منسٹر نے اس سلسلہ میں ضلع انتظامیہ کو ہدایت دی، اس ہدایت کے باوجود مورتی اپنی جگہ باقی رہی اور چہار دیواری بننے لگی۔ مسلمان اب بھی مشتعل نہیں ہوئے بلکہ رابڑی دیوی چیف منسٹر سے دوبارہ رابطہ قائم کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ چیف منسٹر اور لالو یادو اور دیگر ذمہ داران نے مذکورہ مقام کا خود دورہ کیا اور وہاں جاکر اس کو آنکھوں سے دیکھا اور سخت آرڈر کرتے ہوئے فوری طور پر اپنی موجودگی میں مورتی کو ہٹوایا اور دیوار منہدم کرادی۔ ایک واقعہ جس پر پورا بہار شریف تباہ کن فساد کا شکار ہو سکتا تھا وہ پرامن طور پر ٹل گیا۔ جناب جمیل احمد (۶۵ سال) نے جو بہار شریف کے رہنے والے ہیں اور آج کل بتیا میں مقیم ہیں اس واقعہ پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ الرسالہ کی صبر والی پالیسی پر عمل کرتے ہوئے بہار شریف کے مسلمانوں نے اپنے کو محفوظ کر لیا۔

۳ نومبر کو بتیا میں جناب اسلم احمد صاحب (۴۲ سال) کے مکان پر دوپہر کا کھانا کھایا گیا۔ انہوں نے اپنے بہت سے تجربے بتائے۔ وہ سروس کرتے ہیں۔ اس لئے ان کا ملنا جلنا (انٹرایکشن) بار بار ہندوؤں سے ہوتا ہے۔ انہوں نے بتایا کہ بہت سے ہندو جو شروع میں اسلام کے خلاف سخت رائے رکھتے تھے۔ ان سے انہوں نے سنجیدہ انداز میں گفتگو کی اور اسلامی مرکز کی شائع شدہ ہندی اور انگریزی لٹریچر پڑھنے کو دیا۔ اس کے بعد ہندوؤں کا ذہن اللہ کے فضل سے بدل گیا۔ ایک برہمن مسٹر دنے کمار کے بارے میں انہوں نے بتایا کہ پہلے ان کے اندر اسلام کے بارے میں منفی ذہن تھا۔ اب یہ حال ہے کہ ان میں اور ان کے گھر والوں میں اسلام کے بارے میں مثبت ذہن پیدا ہو گیا ہے۔ وہ لوگ اسلامی کتابیں شوق سے پڑھتے ہیں اور اسلام کے کلمات مثلاً الحمد للہ، فی امان اللہ، بسم اللہ الرحمٰن الرحیم وغیرہ بولتے ہیں۔ پہلے اسلام کے بارے میں ان کا

ذہن سخت تھا۔اور اب ان کے دل میں اسلام کے بارے میں نرم گوشہ (soft corner) پیدا ہو گیا۔

جناب جمیل احمد صاحب سے بتیا میں ملاقات ہوئی۔ وہ الرسالہ کے مستقل قاری ہیں۔ انہوں نے کہا کہ انسان اگر اپنی زندگی میں صبر و شکر کا انداز اختیار کرے تو وہ کبھی ناکام نہ ہو۔ کیوں کہ صبر و شکر کا ذہن ناکامی کو بھی کامیابی بنا دیتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ الرسالہ جن باتوں کی تعلیم دیتا ہے، ان کا خلاصہ میرے نزدیک تین ہے۔ صبر، شکر اور اعراض۔ میرا یقین ہے کہ اگر انسان یہ تینوں چیزیں اپنی زندگی میں داخل کر لے تو اس کی دنیا اور آخرت دونوں بن جائے۔ یہ تین نکاتی فارمولا انسان کی کامیابی کا سب سے زیادہ یقینی ذریعہ ہے۔

ایک صاحب نے ایک فرقہ وارانہ واقعہ کا ذکر کیا۔ اس میں ہندو اور مسلمان کے درمیان تناؤ پیدا ہو گیا تھا پولس نے مداخلت کی۔ اور آخر کار ساڑھے تین سو ہندو گرفتار کر لئے گئے۔ ان کے بیان کے مطابق وہ لوگ اب بھی پولس کسٹڈی میں ہیں۔ یہ سن کر میں رو پڑا۔ ایک صاحب نے رونے کا سبب دریافت کیا۔ میں نے کہا کہ اس طرح کے واقعات کو خوشی کے انداز میں لینا سراسر اسلام کے خلاف ہے۔ ہمارے اندر انسانیت کا وہ درد ہونا چاہئے کہ اگر ساڑھے تین سو مسلمان گرفتار ہو کر بند کر دئے جائیں تو جتنا درد ہم کو اس وقت ہو گا اتنا ہی درد اس وقت بھی ہونا چاہئے جب کہ ساڑھے تین سو ہندو گرفتار کر کے بند کر دیئے گئے ہوں۔ مسلمان کی پیٹھ اور ہندو کی پیٹھ میں کوئی فرق نہیں۔ کوڑا خواہ کسی کی پیٹھ پر لگے آپ کو تڑپنا چاہئے۔

جناب ایم ٹی خان صاحب نے ایک واقعہ بتایا کہ پٹنہ میں ایک صاحب فیروز احمد ہیں۔ وہ الرسالہ کی مخالفت کرتے تھے۔ ایم ٹی خان صاحب نے ان سے کوئی بحث نہیں کی۔ صرف یہ کیا کہ ایک موقع پر ان کو الرسالہ مطبوعات میں سے ایک کتاب پڑھنے کو دے دی۔ چند دن کے بعد ان سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے بتایا کہ میں نے الرسالہ کے بارے میں سنا کچھ اور تھا اور پڑھنے کو کچھ اور ملا۔

۳ نومبر کی سہ پہر کو ہم لوگ امداد امام صاحب کے گھر پر گئے۔ یہاں قارئین الرسالہ کی میٹنگ رکھی گئی تھی۔ جناب سید ہاشم رضا صاحب (۶۵ سال) بتیا کے رہنے والے ہیں۔ وہ ۱۹۸۶ سے الرسالہ پڑھ رہے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ اب حالات میں کافی سدھار ہوا ہے مگر ایک مسئلہ یہ ہے کہ مسلمانوں میں کوئی قیادت نہیں۔ مسلمان خانہ خانہ میں بٹا ہوا ہے۔ ان کا کوئی مسلمہ قائد نہیں۔

میں نے کہا کہ اس معاملہ میں مسلمانوں کا مسئلہ فقدان قیادت کا نہیں ہے بلکہ ان کا مسئلہ فقدانِ قبولیتِ قیادت کا ہے۔ قائد ہمیشہ ہر قوم میں موجود رہتا ہے۔ یہ فطرت کا قانون ہے۔ لیکن جس قائد کو لوگ قائد مان لیں وہ ان کا قائد بنے گا اور اگر وہ اس کو قائد نہ مانیں تو اس کو قائد کا درجہ بھی نہیں مل سکتا۔ پرانی مثل ہے: مانو دیو نہیں تو پتھر۔

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کا اصل مسئلہ یہ ہے کہ ان کا مزاج منفی جذباتیت والا مزاج بن گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ایسے افراد کے پیچھے دوڑتے ہیں جو منفی بولی بولیں، جو ہائی پروفائل میں کلام کریں اور جو شخص مثبت بولی بولے اور لو پروفائل میں کلام کرے وہ ان کے درمیان مقبولیت حاصل نہیں کر سکتا۔ قیادت کو وجود میں لانے کے لئے سب سے پہلے قوم کے اندر تعمیری مزاج پیدا کرنا ہوگا۔ اس کے بعد ہی ان کے درمیان کوئی حقیقی قیادت ابھر سکتی ہے۔

جناب نجم الہدیٰ صاحب (۳۵ سال) سے بتیا میں ملاقات ہوئی۔ انہوں نے الرسالہ کے بارہ میں اپنا تاثر بتاتے ہوئے کہا کہ الرسالہ میں صبر واعراض کے بارے میں جو بات کہی جاتی ہے، مجھ کو اس سے اتفاق ہے، خصوصاً ہندستان جیسے ملک میں تو اس کے بغیر کوئی چارہ ہی نہیں۔ میں نے کہا کہ مجھ کو اس سے اتفاق نہیں۔ صبر واعراض کوئی مجبوری کا فارمولا نہیں ہے۔ وہ فطرت کا فارمولا ہے۔ آپ کو ہر جگہ صبر واعراض ہی کے ساتھ رہنا ہے۔ خواہ وہ ہندستان ہو یا اور کوئی مسلم یا غیر مسلم ملک۔

۳ نومبر کی شام کو بتیا کے ٹاؤن ہال میں عمومی جلسہ ہوا۔ وسیع ہال پوری طرح بھرا ہوا تھا۔ جس میں ہندو اور مسلمان دونوں شامل تھے۔ اسٹیج پر شہر کی بڑی بڑی شخصیتیں موجود تھیں۔ مثلاً محترمہ رینو دیوی ایم ایل اے، جناب ڈی آئی جی صاحب، جناب ڈی ایم صاحب اور جناب ایس پی صاحب وغیرہ۔ میں نے تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ تک خطاب کیا۔ پورا مجمع انتہائی خاموشی کے ساتھ سنتا رہا۔

اس تقریر کا مکمل ریکارڈ بتیا والوں کے پاس موجود ہے۔ اور اس کی کاپی ان سے حاصل کی جاسکتی ہے۔ میری تقریر کا خلاصہ یہ تھا کہ اسلام نفرت اور تشدد کا مذہب نہیں، اسلام امن اور خیر خواہی کا مذہب ہے۔ خدا کے ہر بندے کو ہمیں محبت کی نظر سے دیکھنا ہے۔ جس طرح پھول خدا کی ایک تخلیق ہے اسی طرح انسان بھی خدا کی ایک تخلیق ہے پھول خواہ میرے باغ میں ہو یا کسی اور کے باغ میں ہر حال میں وہ قابل تعریف ہے۔ اسی طرح کوئی انسان خواہ وہ ایک قوم سے تعلق رکھتا ہو یا کسی دوسری قوم سے، ہر حال میں وہ اس قابل ہے کہ اس سے انسانی ہمدردی کی جائے۔ جس طرح پھول میں آپ خدا کا حسن دیکھتے ہیں اسی طرح آپ کو ایک انسان میں خدا کا تخلیقی جلوہ دیکھنا چاہئے۔ اگر آپ کے دل میں انسان کے لئے عزت اور ہمدردی کا جذبہ نہ ہو تو یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ خدا کے ساتھ بھی آپ کا سچا تعلق قائم نہیں۔

بتیا کے اس جلسہ کے صدر جناب ڈی آئی جی صاحب تھے۔ تقریر کے بعد انہوں نے لاؤڈ اسپیکر پر اعلان کیا کہ اگر کسی صاحب کو تقریر کے سلسلہ میں کوئی سوال کرنا ہو تو وہ سوال کر سکتے ہیں۔ ڈی آئی جی صاحب نے یہ بات لاؤڈ اسپیکر پر تین بار کہی۔ مگر پانچ منٹ تک انتظار کے باوجود کسی طرف سے کوئی سوال

نہیں آیا۔ اس کے بعد صدر جلسہ نے جلسہ کے خاتمہ کا اعلان کر دیا۔ کچھ لوگوں نے بتایا کہ تقریر کے بعد لوگ اتنا زیادہ مسحور ہو گئے تھے کہ کسی کے سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا سوال کریں۔

میں نے مولانا ثناء اللہ ندوی سے تقریر کے بعد ان کا تاثر پوچھا تو انہوں نے کہا کہ میں اپنے احساسات کو الفاظ میں بیان کرنے سے عاجز ہوں۔ آپ کی باتیں عین فطرت کو اپیل کرتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ لوگ اس کو اپنی فطرت کے مطابق پا کر اس پکار پر لبیک کہہ رہے ہیں۔ اس کا مشاہدہ میں نے بتیا ٹاؤن ہال میں آپ کی تقریر اور وہاں کے پرسکون ماحول میں کیا۔

جناب امداد امام صاحب نے تقریر کے بارے میں کہا "میرے پاس اپنا تاثر بتانے کے لئے الفاظ نہیں ہیں۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میرے الفاظ گم ہو گئے ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ ایک ہندو مارواڑی کو میں نے دیکھا کہ وہ پہلے آیا اور پھر دیکھا کہ وہ واپس جا رہا ہے۔ میں نے دیکھا تو پوچھا کہ کیوں واپس جا رہے ہیں۔ انہون نے کہا کہ یہ تو کوئی مولانا ہیں ان کی باتیں میری سمجھ میں نہیں آئیں گی۔ پھر میں ان کو اپنے ساتھ لے گیا اور اوپر گیلری میں بٹھایا۔ انہوں نے آپ کی پوری تقریر سنی۔

جب وہ واپس جانے لگے تو میں نے اس سے تقریر کے بارے میں ان کا تاثر پوچھا۔ مگر انہوں نے جو کچھ سنا تھا وہ اس میں اتنے گم تھے کہ انہوں نے صرف اپنا سر ہلا دیا اور زبان سے کچھ نہ کہہ سکے، انہوں نے کہا کہ ہم نے ایک عجیب بات دیکھی کہ آپ کی تقریر ختم ہونے کے بعد بھی لوگ کئی منٹ تک خاموش بیٹھے رہے، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ لوگ مبہوت ہوں اور سمجھ میں نہ آتا ہو کہ کیا کریں۔

۴ نومبر کی صبح کو فجر سے کچھ پہلے سو کر اٹھا تو صاحب خانہ امداد امام صاحب چائے کی پیالی لے کر آئے۔ انہوں نے میری طرف پیالی بڑھاتے ہوئے کہا کہ یہ قبض کے لئے مفید ہے۔ میں اپنے مزاج کے اعتبار سے دوا کے نام سے الرجک ہوں۔ کوئی چیز اگر آپ مجھ کو دوا کے نام پر دیں تو میں اس کو لینے سے الرجک رہتا ہوں۔ اپنے اس مزاج کی بنا پر مجھے اس کو لینے میں تردد ہوا مگر صاحب خانہ کی دلجوئی کی خاطر میں نے کہا کہ مجھ کو آدھی پیالی دے دیجئے۔ چنانچہ انہوں نے اس کو کم کر کے مجھے آدھی پیالی دے دی۔

میں نے اس کو پیا تو وہ لیموں کی چائے تھی۔ میں نے بعد کو جناب امداد امام صاحب سے کہا کہ اگر آپ نے کہا ہوتا کہ یہ لیموں کی چائے ہے تو میں شوق سے پوری پیالی پی جاتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ لیموں کی چائے مجھے اپنے شیخ مولانا عبد الباری ندوی کی یاد دلاتی ہے۔ میں ۱۹۶۶ میں کچھ دنوں لکھنؤ میں ان کے گھر پر تھا۔ وہ روزانہ اپنے ہاتھ سے لیموں کی چائے بنا کر مجھے پلاتے اور کہتے کہ یہ بہت مفید ہے۔ اس بنا پر لیموں کی چائے سے مجھے ایک قسم کا روحانی تعلق ہو گیا ہے۔

فجر کی نماز درگاہ محلہ کی مسجد میں پڑھی۔ نماز کے بعد لوگوں نے درس کے لئے کہا۔ امام صاحب نے نماز میں یہ آیت پڑھی تھی۔ یا أیھا الذین آمنوا اتقوا اللہ ولتنظر نفس ما قدمت لغد (الحشر ۱۸)۔ میں نے اس آیت کو لے کر ایک تربیتی تقریر کی۔ میں نے کہا کہ اللہ نے اس آیت میں یہ فرمایا ہے کہ انسان یہ دیکھے کہ وہ کل کے لئے کیا بھیج رہا ہے۔ لیکن لوگوں کا حال یہ ہے کہ وہ مسجد میں تو اس آیت کو سنتے ہیں لیکن باہر جاکر برعکس طور پر اس فکر میں لگ جاتے ہیں کہ اپنے آج کے لئے میں کیا کماؤں۔ یعنی ساری فکر اس بات کی ہو جاتی ہے کہ آج میں کیا حاصل کروں۔ میں نے کہا کہ لوگ نماز تو پڑھتے ہیں مگر اس سے اپنے لئے ہدایت نہیں لیتے۔ وہ مسجد والے اعمال تو کرتے ہیں مگر وہ مسجد والے اسباق نہیں لیتے۔ میں نے کہا کہ یاد رکھئے اصل اہمیت مسجد والے اعمال کی نہیں ہے بلکہ مسجد والے اسباق کی ہے۔

۴ نومبر کی صبح کو مدرسہ اسلامیہ بتیا کا معائنہ کیا۔ اس مدرسہ کی بنیاد ۱۸۹۴ میں رکھی گئی۔ یہ ایک تاریخی مدرسہ ہے۔ اس مدرسہ کے ذمہ دار پروفیسر ناظم صاحب ہیں۔ یہاں دار الافتا اور دار القضاء بھی قائم ہے۔ یہاں طلبہ واساتذہ کے سامنے ایک مختصر تقریر کی۔ میں نے کہا کہ پچھلے دو سو سال کے درمیان مسلمانوں نے بہت سے کام شروع کیے۔ مگر تھوڑی دیر کے بعد وہ ختم ہوتے رہے۔ لیکن مدرسہ کا کام غالباً واحد کام ہے جو قابلِ بقا (sustainable) ثابت ہوا۔ ایک حدیث ہے کہ خیر الاعمال الی اللہ ادومھا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ مداومت میں کوئی پر اسرار صفت ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مداومت قانون فطرت کے مطابق ہے۔ جو کام شروع کرنے کے بعد مسلسل کیا جاتا رہے اس کے ساتھ تائیدی عوامل شامل ہوتے رہتے ہیں جو اس کو تقویت دے کر آگے بڑھاتے رہتے ہیں، یہاں تک کہ اس کو کامیابی کی منزل تک پہنچا دیتے ہیں۔

۴ نومبر کی صبح کو بتیا کے ڈسٹرکٹ جج راجندر پرساد چودھری کی دعوت پر ہم لوگ ان کی رہائش گاہ پر گئے، وہاں ان سے تفصیلی ملاقات ہوئی۔ میں ان سے قانون اور عدالت کے بارے میں مختلف قسم کی معلومات لیتا رہا۔ آخر میں میں نے ان سے پوچھا کہ آپ کا جو پروفیشن ہے اس میں آپ کو بہت سکون ہوگا اور آپ اس سے انجوائے کرتے ہوں گے۔ انہوں نے کہا کہ نہیں۔ میں نے وجہ پوچھی تو انہوں نے کہا کہ ہم لوگوں کو ایک ہی روٹین پر چلنا پڑتا ہے۔ وہی وکیل کی باتیں، وہی گواہوں کے بیانات، وہی قانونی بحثیں، وہی ایک قسم کی دستاویزات۔ ہمارے پروفیشن میں کوئی نئی چیز نہیں ہوتی۔ اور آپ جانتے ہیں کہ انسان ہر دن نئی چیز چاہتا ہے۔ روٹین کے کام کو انسان بس خشک ڈیوٹی کے طور پر کرتا ہے، خوشی کے طور پر نہیں۔

جج صاحب کے یہاں پہنچ کر ہم لوگ گیٹ کے اندر داخل ہوئے تو ہمارے سامنے ایک شاندار مکان تھا۔ جو وسیع لان اور سرسبز ماحول کے اندر واقع تھا۔ بظاہر ایک عام آدمی کا تاثر یہ ہوگا کہ اس مکان میں

ایک خوش اور مطمئن انسان رہتا ہے۔ مگر جج صاحب سے گفتگو کے بعد محسوس ہوا کہ وہاں شاندار کوٹھی کے اندر صرف ایک بجھا ہوا انسان ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ پر مسرت زندگی کا راز عہدہ اور کوٹھی اور ظاہری شان و شوکت میں نہیں، بلکہ اس کا راز داخلی کیفیت میں ہے اور یہ داخلی کیفیت صرف اس انسان کو ملتی ہے جس نے مادی رونقوں سے بلند تر ایک ایسی اعلیٰ حقیقت پالی ہو جس میں وہ جی سکے۔

جناب سید عبد المجید صاحب نے بتیا کے خطاب کے بارے میں اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے کہا: ٹاؤن ہال میں ۲۰۰۰ سے زیادہ کا مجمع تھا۔ وہاں آنے والوں میں عیسائی حضرات بھی تھے اور ہندو حضرات بھی کافی تعداد میں موجود تھے۔ پورا ٹاؤن ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ لوگ کافی متاثر ہوئے۔ جناب اشوینی کمار مشرا ایڈووکیٹ اور ارجن شنکر سنگھ ایڈووکیٹ نے کہا کہ آج کی تقریر سے ہم لوگ بہت کچھ سیکھ کر جا رہے ہیں۔ جناب اشوینی کمار مشرا بتیا ایڈوکیٹس ایسوسی ایشن کے سابق صدر ہیں۔ انہوں نے میرے پروگرام کے بارے میں ایک تفصیلی خط روانہ کیا۔ اس میں انہوں نے بتایا کہ آپ کی تقریر کے ذریعہ مجھے اسلام کی تعلیمات کو سمجھنے میں بہت مدد ملی۔ ان کے خط کا ایک حصہ یہاں نقل کیا جاتا ہے:

Respected Maulana,

I extend my profound respect and regards to you for your marvelous lecture delivered on 3.11.2000 in the Town Hall. Whatever you spoke, you were speaking from your heart. It appears that you have reached the highest state of realisation.

I know the four cardinal principles of Islam and its concept of one formless God but I was ignorant of the entire philosophy of Islam including its preaching in respect of ethics, morality total code of conduct and, above all, its policy of peaceful coexistence with all the creation of the universe. You have also unfolded the two secrets of Islamic Religion i.e. account ability of earthly deeds of the individual and reaping of its consequences. Secondly every body must live in peace and harmony and coexist with other creatures of the universe, extending his love and affection to all.

Your mission is a part of God's Mission. You will make history. May God bless you? Truth always prevails.

Ashwini Kumar Mishra
Ex-President,
Bettiah Advocates Association

محمد ثناء اللہ صاحب نے اپنا تاثر بتاتے ہوئے کہا: اب تک ہم امن و شانتی کا شبد سنتے تھے، اس کو پوری طرح سمجھا نہ تھا۔ آج کی تقریر سے امن و شانتی کا مطلب سمجھا اور اس کی کتنی زیادہ اہمیت ہے اس کو جانا۔

۴ نومبر کی دوپہر کو ہم لوگ مدرسہ جامعہ اسلامیہ قرآنیہ (سمیرا) گئے۔ اس مدرسہ کا قیام ۱۸۱۸ء میں ہوا اس کے بانی مولانا احسان اللہ و مولانا جعفر علی صاحب ہیں۔ یہ مدرسہ پہلے پوڑی گنڈک ندی کے کنارے پر واقع تھا۔ وہاں وہ سیلاب کے دوران ۱۹۶۲ میں دریائی کٹاؤ کی نذر ہو گیا۔ اس وقت کا مدرسہ موجودہ مدرسہ سے چھوٹا تھا۔ لیکن پھر دو سال بعد ۱۹۶۴ میں وہ زیادہ بڑے اور وسیع مدرسہ کی صورت میں قائم ہو گیا۔ یہ واقعہ علامتی طور پر بتاتا ہے کہ دنیا میں ناکامی کوئی چیز نہیں۔ عین ممکن ہے، پہلی بار ناکام ہونے کے بعد آدمی دوسری بار پہلے سے بھی زیادہ بڑی کامیابی حاصل کر لے۔ اس مدرسہ میں طلبہ و اساتذہ کا ایک جلسہ ہوا جس سے میں نے مختصر خطاب کیا۔ جلسہ کو شروع کرتے ہوئے عزیز الرحمٰن صاحب نے یہ شعر پڑھا:

فکر عقبیٰ نہ خوف خدا ہے   کیسا نادان وہ آدمی ہے
کام کرتا ہے دوزخ کا لیکن   سوچتا ہے کہ جنت ملے گی

۴ نومبر کو ساڑھے بارہ بجے مدرسہ جامعہ اسلامیہ (سمیرا) سے ہم لوگ دوبارہ بتیا کے لئے روانہ ہوئے۔ راستہ میں اپنے ساتھیوں سے بات کرتے ہوئے میں نے کہا کہ موجودہ دنیا میں کام کرنے کے لئے صرف اخلاص کافی نہیں، اسی کے ساتھ لازمی طور پر ڈسپلن بھی ضروری ہے۔ کوئی آدمی بالفرض اخلاص کا پہاڑ ہو لیکن اگر اس کے اندر ڈسپلن نہ ہو تو وہ کوئی بڑا کام نہیں کر سکتا۔ اخلاص اس بات کی ضمانت ہے کہ آدمی آخرت کی ناکامی سے محفوظ رہے۔ مگر موجودہ دنیا اسباب کی بنیاد پر قائم ہے۔ یہاں اپنے عمل کو کامیاب بنانے کے لئے ڈسپلن ضروری ہے۔ ڈسپلن سے مراد منظم عمل ہے، اور منظم عمل کسی بھی بڑے کام کے لئے لازمی شرط کی حیثیت رکھتا ہے۔

ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے میں نے کہا کہ اسلام کا مکمل ضابطۂ حیات ہونا دراصل ہر فرد کی اپنی اختیاری زندگی کا عنوان ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر آدمی اپنی پیش آمدہ صورت حال میں دیکھے کہ اس موقع کے لئے اسلام کی تعلیم کیا ہے اور پھر وہ اس پر اختیارانہ طور پر عمل کرے۔

۴ نومبر کی سہ پہر کو بتیا پہنچے۔ اس وقت وہاں خواتین کا پروگرام رکھا گیا تھا۔ ہمارے پہنچنے سے پہلے خواتین وہاں جمع ہو چکی تھیں۔ یہاں میں نے اسلام اور خواتین کے موضوع پر ایک تقریر کی۔ شاہد جمال صاحب کی نوٹ بک پر میں نے یہ جملہ لکھا: عذر ہر ایک کو پیش آتے ہیں، دانش مند وہ ہے جو عذر کو استعمال نہ کرے۔

بہت گہرے معانی ہوتے ہیں۔ بہار کے کئی لوگوں نے بہار والوں کے بارے میں اپنی رائے بتاتے ہوئے کہا کہ بہار والوں کا ایک خاص مزاج ہے کہ وہ سنتے زیادہ ہیں اور بولتے کم ہیں۔

جناب سرفراز احمد صاحب (۴۳ سال) سبیا دیوراج کے رہنے والے ہیں۔ وہ ایک مکانیکل انجینئر ہیں۔ بظاہر ان کو اپنی ڈگری کے اعتبار سے خوش اور مطمئن ہونا چاہئے مگر وہ مایوسی کا شکار ہو رہے تھے۔ میں نے ان سے کہا کہ اپنی زندگی کی قدر کرنا سیکھئے، اپنے آپ کو تباہی سے بچائیے اور اس کا واحد راز یہ ہے کہ آپ اپنی آرزوؤں کو اتنا گھٹائیے کہ جو کچھ آپ کو ملے وہی آپ کو کافی نظر آئے۔

میں نے کہا کہ یہ مشورہ میں صرف آپ کو نہیں دے رہا ہوں بلکہ اللہ کے فضل سے میں خود اسی پر قائم ہوں۔ میں نے اپنی مادی خواہشوں کو اتنا زیادہ کم کر رکھا ہے کہ جو کچھ بھی میرے پاس ہے وہی مجھے زیادہ معلوم ہوتا ہے۔ بیشتر لوگ جو مادی اعتبار سے مایوسی کے شکار ہوتے ہیں ان کی اصل مشکل یہ ہے کہ ان کے اندر صحیح مزاج نہیں ہوتا۔ وہ شعوری یا غیر شعوری طور پر اپنے لئے اتنے زیادہ کے طالب ہوتے ہیں کہ ہر ملنے والی چیز انہیں کم دکھائی دیتی ہے۔

۴ نومبر کی رات کو نماز عشاء کے بعد مدرسہ تعلیم القرآن سبیا دیوراج کے وسیع میدان میں عمومی جلسہ ہوا۔ اس جلسہ میں مدرسہ کے طلباء اور اساتذہ کے علاوہ بڑی تعداد میں اطراف کے لوگ شریک ہوئے۔ یہاں میری تقریر کا موضوع دعوت تھا۔ میں نے اپنی تقریر میں چند باتیں کہیں۔ ایک یہ کہ دعوت دوسرے کے درد کو اپنے سینہ میں محسوس کرنے کا نام ہے۔ دردمند دل ہی دعوت کا کام کر سکتا ہے۔

دوسری بات یہ کہ دعوت کا نقطہ آغاز یہ ہے کہ داعی اور مدعو کے درمیان معتدل فضا ہو، تعصب و نفرت کا ماحول نہ ہو۔ اس قسم کے ماحول کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ مدعو جو بات سنتا ہے اس پر وہ ٹھنڈے دل سے سوچتا ہے۔ کوئی منفی احساس اس کی سوچ کے عمل میں رکاوٹ نہیں بنتا۔ میں نے کہا کہ موجودہ زمانہ میں ہمیں دو قسم کے کام کرنے ہیں، ایک طرف مسلمانوں کی اصلاح اور دوسری طرف غیر مسلموں میں دین کی اشاعت۔ یہ دونوں ہی کام یکساں طور پر اہم ہیں۔ ضرورت ہے کہ تقسیم کار کے اصول پر دونوں کام کو مؤثر انداز میں انجام دیا جائے۔

۵ نومبر کی صبح کو مدرسہ تعلیم القرآن کی مسجد میں فجر کی نماز پڑھی گئی۔ پوری مسجد بھری ہوئی تھی۔ پروگرام میں شرکت کے لئے باہر کے لوگ بھی آئے تھے۔ مثلاً فجر کی نماز کے بعد حافظ ممتاز عالم سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے کہا کہ میں کھیرٹیا کا رہنے والا ہوں۔ بیس کلومیٹر سے چل کر صرف آپ کی بات سننے کو آیا ہوں۔

نماز فجر کے بعد مجھ سے درس کے لئے کہا گیا۔ تقریباً آدھ گھنٹہ تک میں نے قرآن وحدیث کی روشنی میں تذکیری انداز کا خطاب کیا۔ ایک آیت اور ایک حدیث بیان کرتے ہوئے میں نے کہا کہ اسلام نہ تو کوئی پراسرار دین ہے اور نہ کوئی رسمی اور نسلی دین۔ اسلام اللہ کی ایک نعمت ہے جو اس نے اپنے بندوں کے لئے کھولی ہے۔ حقیقی معنوں میں مومن ومسلم وہ ہے جو اسلام کو ایک ایسی عظیم نعمت کے طور پر پائے جس سے اس کی روح سرشار ہو گئی ہو۔

جناب مولانا محمد بدر الحق قاسمی (۴۵ سال) صدر مدرس تعلیم القرآن سے سبیا میں ملاقات ہوئی۔ انہوں نے الرسالہ کے سلسلہ میں اپنے تاثرات کا اظہار ان الفاظ میں کیا "الرسالہ پڑھ کر مجھے ایک شعوری زندگی گزارنے کا احساس ہوا۔ اس لئے کہ شعور ہی کے ذریعہ انسان اپنے کمال تک پہنچتا ہے۔

۵ نومبر کی صبح کو مدرسہ تعلیم القرآن سبیا دیوراج کو دیکھا۔ یہاں مدرسہ کے طلباء اور اساتذہ پر مشتمل ایک اجتماع ہوا۔ بچے زیادہ تر چھوٹی عمر کے تھے۔ جب میں نے ان چھوٹے بچوں کو دیکھا تو مجھے ستر سال پہلے ۱۹۳۰ کا اپنا زمانہ یاد آیا۔ اس وقت میں اسی طرح ایک بچے کی صورت میں اپنے گاؤں کے مدرسہ میں پڑھتا تھا۔ میں نے سوچا کہ چھوٹے چھوٹے بچوں کو لے کر ان کی تعلیم کے لئے مدرسہ چلانا کتنا بڑا کام ہے۔ اگرچہ وہ بظاہر بہت چھوٹا کام نظر آتا ہے۔

ان چھوٹے بچوں کو اپنے مستقبل کے بارے میں کچھ نہیں معلوم۔ یہ ان کے بڑے ہیں جن کو ان کے مستقبل کے بارے میں سوچنا اور فیصلہ کرنا ہے۔ بچوں کا بے خبری کی عمر میں ہونا باخبری کی عمر والے بڑوں کی ذمہ داری میں بے پناہ اضافہ کر دیتا ہے۔ یہ بچے خود اپنے مستقبل کے بارے میں سوچ نہیں سکتے۔ یہ ان کے بڑوں کے لئے دوہرا کام ہے کہ وہ اپنے مستقبل کے بارے میں بھی سوچیں اور بچوں کے مستقبل کے بارے میں بھی۔

مدرسہ کا پروگرام شروع ہوا تو پہلے قرآن کی تلاوت کی گئی۔ ایک طالب علم نے قرآن کا ایک رکوع پڑھا: وننزل من القرآن ما هو شفاء ورحمة للمؤمنين۔ اس تلاوت کے بعد ایک طالب علم نے نعت پڑھی اس کا ایک شعر یہ تھا:

لگاؤں میں آنکھوں میں سرمہ سمجھ کر جو مل جائے مجھ کو غبار مدینہ

مدرسہ تعلیم القرآن میں تقریر کے بعد ایک صاحب کھڑے ہوئے وہ انگریزی اخبار میں شائع شدہ ایک مضمون لئے ہوئے تھے جس میں کسی انتہاء پسند ہندو نے لکھا تھا کہ مسلمانوں کو ہندستان میں سکنڈ کلاس سٹیزن بن کر رہنا ہوگا ورنہ ان کی حالت اس ملک میں درست نہیں ہو سکتی۔

تعلق ہے وہ بلاشبہ پُرامن طور پر پھیلا ہے، اور آج بھی وہ ساری دنیا میں پرامن طور پر پھیل رہا ہے۔ اسلام مکمل طور پر ایک فطری مذہب ہے۔ اور سچا فطری مذہب اپنے آپ میں اتنا پرکشش ہوتا ہے کہ اس کی اشاعت کے لئے کسی جبر و تشدد کے استعمال کی ضرورت نہیں۔

جناب امداد امام صاحب بتاتے ہیں میں نے پوچھا کہ الرسالہ کے تعلق سے آپ کوئی خاص واقعہ بتائیے۔ انہوں نے کہا کہ اپریل ۱۹۹۱ کا واقعہ ہے، میں سیوان سے حاجی پور ہوتے ہوئے بذریعہ ٹرین پٹنہ جارہا تھا۔ میرے ساتھ میری بیوی اور میرا ابیس سالہ بھتیجہ افروز امام تھا۔ افروز امام اس وقت بیمار حالت میں تھا۔ سیوان سے ہم لوگوں کو ویشالی اکسپریس کے ذریعہ روانہ ہونا تھا۔ ٹکٹ لے کر ہم لوگ بوگی میں داخل ہوئے تو اس کی تمام سیٹوں پر لوگ پہلے سے بیٹھے ہوئے تھے ہم لوگ اندر داخل ہو کر کھڑے ہو گئے۔ میں نے چاہا کہ کم از کم میرے بیمار بھتیجے کو بیٹھنے کی جگہ مل جائے۔ میں نے سیٹ کے کنارے بیٹھے ہوئے مسافر سے کہا کہ یہ بچہ بیمار ہے بیٹھنے کی جگہ دے دیں۔ ہندو مسافر نے میری بات کو ذرا بھی قابل توجہ نہ سمجھا۔ اس نے نہایت بے رخی سے کہا کہ کیا میں آپ کو اپنے سر پر بٹھاؤں۔

میں نے کئی بار اس مسافر سے جگہ دینے کو کہا مگر اس کی شدت میں کمی نہ آئی۔ ابھی ٹرین اسٹیشن پر کھڑی ہوئی تھی، اس دوران ایسا ہوا کہ مذکورہ مسافر نے پلیٹ فارم کے ایک خوانچہ فروش "چائے والے" سے چائے لی، پینے کے بعد چائے والے نے پیسہ مانگا جو دو روپیہ ہوتا تھا۔ مسافر نے اپنی جیب سے دو روپیہ نکالا اور چائے والے کو دینا چاہا مگر سکہ چھوٹ کر گر پڑا اور کھڑی ہوئی گاڑی کے نیچے چلا گیا۔ مسافر کے پاس مزید کھلے ہوئے سکے نہ تھے۔ اس نے سو روپیہ کا نوٹ نکالا مگر چائے فروش نے اس کو لینے سے انکار کر دیا۔ اس نے کہا کہ میرے پاس اتنے پیسے نہیں ہیں کہ میں تم کو لوٹاؤں۔

اب مسافر میں اور چائے والے میں تکرار ہو گئی۔ شدت بڑھی تو میں نے خاموشی کے ساتھ جیب سے دو روپیہ نکالا اور چائے والے کو دے دیا، مسافر نے کہا کہ میرے پاس کھلا ہوا پیسہ کہاں ہے جو میں آپ کو لوٹاؤں گا۔ میں نے کہا کہ میرا مقصد تو اس جھنجھٹ کو ختم کرنا تھا۔ باقی آپ کو پیسہ لوٹانے کی ضرورت نہیں۔

اس کے بعد ایک معجزاتی واقعہ ہوا جو مجھے اب تک پوری طرح یاد ہے۔ ہندو مسافر تھوڑی دیر خاموش رہا۔ اس کے بعد خود ہی اس نے پاس بیٹھے ہوئے اپنے لڑکے سے کہا کہ اٹھو، اوپر کا سامان اتار کر سیٹ کے نیچے رکھ دو اور تم اوپر چلے جاؤ۔ اس کے بعد اس نے مجھ سے کہا کہ بابو جی یہاں بیٹھ جائیے۔ اس طرح اس نے جگہ خالی کر کے مجھ سے بیٹھنے کے لئے کہا۔ میں نے کہا کہ میں تو کھڑا رہوں گا آپ لوگ

اطمینان سے بیٹھئے۔ مگر وہ خود کھڑا ہو گیا اور کہا کہ ہم کو تو صرف اگلے اسٹاپ تک جانا ہے۔ آپ دونوں صاحبان اطمینان کے ساتھ یہاں بیٹھ جائیں۔

میں نے سوچا کہ مذکورہ ہندو مسافر میں اتنا فرق کیوں آیا۔ وہ چند منٹوں میں کیسے بدل گیا۔ اس کا سبب یہ ہے اس نے پہلے جناب امداد امام صاحب کو اپنا حریف سمجھا تھا مگر ان کا اخلاق دیکھنے کے بعد اس نے انہیں دوست کے روپ میں دریافت کر لیا۔ کیوں کہ پیسہ دینے سے پہلے امداد امام صاحب اس کو "چھیننے والے" کے روپ میں دکھائی دے رہے تھے مگر بعد کو وہ اسے دینے والے کے روپ میں نظر آنے لگے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس دنیا میں کسی کی کوئی تصویر آخری تصویر نہیں۔ حسن تدبیر سے آپ کل کے دشمن کو اپنا آج کا دوست بنا سکتے ہیں۔

بہار کا سفر پورے ایک ہفتہ کے لئے تھا۔ اس دوران میں تقریباً ڈیڑھ درجن مقامات پر گیا۔ ہر جگہ لوگ میری تقریر اور گفتگو سننے کے لئے طوفان کی طرح امڈ پڑے۔ مولانا عبد الرحیم امدادی نے ہماری کتابوں کا اسٹال لگایا تھا۔ امدادی صاحب نے کہا کہ ہر جگہ لوگ پیسہ دے کر کتابوں کو لوٹ رہے تھے۔ میں نے دیکھا کہ لوگ محبت کی حد تک میرے گرویدہ ہو رہے ہیں۔ حتی کہ کئی بار میں اپنی عادت کے مطابق ان لوگوں پر برہم ہوا مگر اس کے باوجود لوگ اتنا خوش تھے کے مجھ سے مل کر رو پڑتے تھے۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ جیسے ان کا کوئی محبوب شخص ان کے پاس آگیا ہو۔ درمیان میں رحمٰن نگر تھا وہاں لوگوں نے استقبال کا انتظام کیا تھا۔ وہاں ان لوگوں نے کچھ دیر کے لئے ہم لوگوں کو روک لیا۔

جناب اطیعوا الرحمٰن عرف ننھے بابو (۴۵ سال) شروع سے الرسالہ پڑھتے ہیں۔ ان کا نام سمجھنے میں مجھے دقت پیش آئی۔ پھر سمجھ میں آیا کہ یہ تأبطَ شرا کے اصول پر ہے، یعنی وہ اسم نہیں ہے بلکہ ایک فعلیہ جملہ کو اسم بنا لیا گیا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ رحمٰن کی اطاعت کرو۔ انہوں نے اپنا تاثر بتاتے ہوئے کہا کہ الرسالہ کا خلاصہ مثبت طرز فکر ہے۔ انہوں نے کہا کہ الرسالہ کی کچھ باتوں کو سمجھنا ہمارے لئے بظاہر مشکل ہوتا ہے تو ہم یہ کرتے ہیں کہ اس پر آپس میں مذاکرہ کرتے ہیں۔ اس طرح یہ معاملہ واضح ہو جاتا ہے۔

میرے پاس اکثر ایسے خطوط آتے ہیں جن میں اسی مسئلہ کا ذکر ہوتا ہے جس کا ذکر اطیعوا الرحمٰن صاحب نے کیا۔ وہ ہم سے شکایت کرتے ہیں کہ وہ بات کیوں اس طرح لکھی گئی جو ہماری سمجھ میں نہیں آئی۔ میں ان حضرات سے کہوں گا کہ وہ ایسے معاملہ میں اطیعوا الرحمٰن صاحب کی پیروی کریں۔ جو بات خود سمجھ میں نہ آئے اس کو مل کر سمجھنے کی کوشش کریں۔

جناب محمد حفظ الرحمٰن عرف ننھے بابو نے کئی دلچسپ قصے بتائے۔ انہوں نے کہا کہ باتیں اکثر ایک سے دوسرے تک پہنچ کر بدل جاتی ہیں۔ ایک صاحب شہر میں گئے اور تعلیم حاصل کی۔ وہاں سے وہ تسلیمات سیکھ کر آئے۔ گاؤں میں آکر جب ان کی ملاقات لوگوں سے ہوئی تو گاؤں والوں سے انہوں نے کہا کہ "تسلیمات"۔ گاؤں والوں کی سمجھ میں یہ لفظ نہ آیا۔ انہوں نے سمجھا کہ یہ شہر جا کر اپنا طریقہ بھول گئے ہیں، سلام کے بجائے "تسلہ میں ہاتھ" کہہ رہے ہیں۔ اس ایک واقعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ باتیں اکثر کس طرح بگڑ جاتی ہیں۔ حتی کہ ایک صحیح بات غلط مفہوم کی حامل بن جاتی ہے۔

ڈاکٹر خورشید انور صاحب (۴۰ سال) گیا کے رہنے والے ہیں۔ ان سے میں نے پوچھا کہ الرسالہ کے بارے میں اپنا تاثر بتائیے۔ انہوں نے کہا کہ میں باضابطہ الرسالہ کا دس سال سے قاری ہوں۔ الرسالہ سے اسلام کو صحیح طور پر سمجھنے کا رجحان پیدا ہوا۔ ویسے تو خاندانی مسلمان تھا۔ لیکن الرسالہ کو پڑھ کر اسلام کی اصل روح سمجھنے میں آسانی ہوئی۔ خاص طور پر آپ کی کتاب "پیغمبر انقلاب" نے مجھے کافی متاثر کیا۔

جناب محمد اے خاں (۴۷ سال) نے اپنا تاثر الرسالہ کے متعلق ان الفاظ میں بتایا: "میں نے حضرت کو بارہا اخبار میں دیکھا، ٹی وی پر دیکھا اور ان کے مضامین اخباروں میں پڑھے۔ جس سے میں بہت متاثر ہوا۔ ان سے مجھے زندگی کی حقیقت کو سمجھنے میں کافی مدد ملی۔ بالخصوص صبر و شکر اور اعراض کی باتوں نے میرے وجود کو ہلا دیا۔ بلاشبہہ حضرت کے مضامین ان کی کتابیں حالیہ نسل کے لئے اور آئندہ نسلوں کے لئے بھی مشعل راہ ہیں"۔

جناب محمد غیاث الدین (۳۰ سال) نے کہا کہ میں نے ابھی چند رسالے پڑھے ہیں۔ لیکن اس نے مجھے اتنا متاثر کیا کہ میں صاحب الرسالہ کا شیدائی ہو گیا، اس نے میرے وجود کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ جو لوگ ان کی شخصیت پر انگلیاں اٹھاتے ہیں وہ یا تو عقل سلیم نہیں رکھتے یا وہ عصبیت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اللہ ان کو ہر طرح سے محفوظ رکھے۔

۵ نومبر کو ۲ بجے D. M. اکیڈمی ہال (گیا) میں میری تقریر ہوئی۔ پورا وسیع ہال بھرا ہوا تھا۔ بہت سارے لوگ باہر کھڑے تھے۔ یہاں ہندوؤں کی بھی بہت بڑی تعداد موجود تھی۔ یہاں پریس رپورٹر بھی تھے جو زیادہ تر ہندو تھے۔ یہ خطاب پینتالیس منٹ کا تھا۔ جناب احمد صاحب گیا (۶۶ سال) نے کہا کہ میں الرسالہ پڑھتا ہوں۔ میری رائے یہ ہے کہ جسم بیمار ہو جائے تو ہو جائے لیکن ذہن بیمار نہ ہونا چاہئے۔ انہوں نے کہا کہ قوم کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ وہ ذہن کے اعتبار سے بیمار ہو گئی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ آپ اسی ذہنی بیماری کا علاج کر رہے ہیں اور موجودہ حالات میں بلاشبہہ یہ بہت بڑا کام ہے۔

جناب غلام الحسنین صاحب (٦٦ سال) نے کہا کہ میں الرسالہ اور الجمعیۃ ویکلی کے وقت سے آپ کی تحریریں پڑھتا تھا۔ اور اب تک پڑھ رہا ہوں۔ اس کے علاوہ دوسری جماعتوں اور شخصیتوں کو بھی کافی پڑھا ہے۔ آپ کی تحریروں کے بارے میں میری رائے یہ ہے کہ اس دور میں آپ صحیح اسلامی رہنمائی دے رہے ہیں۔

۵ نومبر کی رات کو جامعہ ہارونیہ یتیم خانہ (گیا) میں ایک تقریر ہوئی۔ اس تقریر میں میں نے اسلام کی اخلاقی اور سماجی تعلیمات بیان کیں اور بتایا کہ اسلام امن اور محبت اور خیر خواہی کا مذہب ہے۔ وہ نفرت اور تشدد کا مذہب نہیں۔

جناب اکلیشور ناتھ ترپاٹھی (۵۰ سال) گیا کے میڈل اسکول میں استاد ہیں۔ وہ دوسری کئی قابل تعریف خصوصیات کے ساتھ ایک اچھے شاعر بھی ہیں۔ ان کی شاعری میں روحانی ذوق ہوتا ہے۔ ٦ نومبر کی صبح کو انہوں نے اپنے کچھ گیت سنائے۔ حاضرین بہت محظوظ ہوئے۔ ان کے گیت کا ایک شعر یہ تھا:

کون سے دیش جا اڑی تتلی   پنکھ پھولوں سے چھل گیا یارو

شاعر کے ذہن میں کیا خیالات ہوں گے جو ان الفاظ میں ڈھل گئے۔ مگر میں نے جب شعر کو سنا تو میری سمجھ میں آیا کہ شاید اس کا مطلب یہ ہے کہ آج زمانہ میں اتنا زیادہ بگاڑ آگیا ہے کہ نہ صرف برے لوگ اس کی زد میں آئے ہیں بلکہ وہ لوگ جو اپنے اخلاق کے اعتبار سے بے ضرر (harmless) ہیں وہ بھی اس عمومی بگاڑ کی زد سے محفوظ نہیں۔

مثلاً آج ہی صبح کو ایک واقعہ معلوم ہوا جو گویا اس خوبصورت شعر کی تشریح ہے۔ جناب سید قیصر امام صاحب جو ایک بینک میں مینیجر ہیں۔ اور عمومی شہادت کے مطابق وہ نہایت بااخلاق اور اپنی ڈیوٹی پوری کرنے والے، کرپشن سے دور انسان ہیں۔ وہ آفس میں ڈیوٹی پوری کر کے خاموشی کے ساتھ واپس اپنی اسکوٹر سے آرہے تھے کہ راستہ میں کچھ بندوق برداروں نے انھیں گھیر لیا۔ وہ اپنی گاڑی تیز کر کے بھاگے تو ان ظالموں نے پیچھے سے گولی ماردی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ تین مہینہ تک اسپتال میں پڑے رہے۔ انہوں نے بتایا کہ ابھی پوری طرح نارمل نہیں ہوسکا ہوں۔

کسی سماج کے بگاڑ کا پہلا مرحلہ یہ ہے کہ لوگوں کے اندر یہ مزاج ہو کہ وہ اپنے مخالفین کو ستائیں لیکن امن پسند لوگوں سے تعرض نہ کریں۔ لیکن جب بگاڑ زیادہ بڑھتا ہے تو یہ فرق مٹ جاتا ہے، پہلے مرحلہ میں صرف برے لوگ ان کی سرکشی کا تجربہ کرتے ہیں لیکن دوسرے مرحلہ میں یہ حال ہوتا ہے کہ معصوم تتلیاں بھی ان کے شر سے محفوظ نہیں رہتیں۔

جناب خورشید انور صاحب (۴۰ سال) گیا کے رہنے والے ہیں۔ وہ پرفیسر کلیم الدین کے شاگرد

ہیں۔ ان سے میں نے پوچھا کہ پروفیسر کلیم الدین احمد کی ایک بات بہت نزاعی رہی ہے اور وہ علامہ اقبال کے بارے میں ان کی رائے ہے۔ آپ ان کے شاگرد رہے ہیں۔ اپنی ذاتی واقفیت کی بنیاد پر بتائیے کہ ان کا اقبال کے بارے میں کیا خیال تھا۔ انہوں نے بتایا کہ پہلی بات تو یہ ہے کہ وہ اقبال کو شاعر ہی نہیں مانتے تھے۔ دوسری بات یہ کہ ان کا کہنا یہ تھا کہ اقبال کی شاعری کو آفاقی شاعری نہیں کہا جاسکتا۔

جناب مولانا حفظ الرحمٰن صاحب خانقاہ خیر آباد (بگہا) مدرسہ شمس العلوم کے پرنسپل ہیں۔ وہ ایک باغ و بہار آدمی ہیں۔ مجلس کو اپنی دلچسپ باتوں سے زعفران زار کر دیتے ہیں۔ انہوں نے ایک دلچسپ لطیفہ بیان کیا۔ انہوں نے کہا کہ بہار میں پہلے تعلیم بہت کم تھی۔ پیر لوگ ہر سال فصل کے موقع پر یہاں آتے تھے اور لوگ ان کا بہت احترام کرتے تھے۔ ان کی ہر بات کو مان لیتے تھے۔ ایک گاؤں میں ایک قصہ پیش آیا۔ ایک لڑکے کی شادی ہوئی پھر اس کی بیوی آئی۔ اس کے بعد اس نے یہ کیا کہ باپ کی ساری جائداد پر قبضہ کر لیا اور ماں کو گھر سے نکال دیا۔ اس کے بعد ان کے گاؤں کے پیر صاحب وہاں آئے تو ان سے کہا گیا کہ یہاں ایسا قصہ ہوا ہے کہ بیٹے نے ساری جائداد پر قبضہ کر کے ماں کو گھر سے نکال دیا ہے۔ پیر صاحب نے کہا کہ ٹھیک ہے، میں قرآن کے ذریعہ اس کا فیصلہ کروں گا۔ آپ لوگ ایسا کریں کہ میلاد شریف کا انتظام کریں۔ چنانچہ میلاد کا انتظام کیا گیا۔ گاؤں کے لوگ اکٹھا ہوئے۔ پیر صاحب نے تقریر کرتے ہوئے سورۃ اللھب پڑھی: تبت یدیٰ ابی لھب و تبّ ما أغنی عنه ماله و ما کسب۔

اس آیت کو خوش الحانی کے ساتھ پڑھنے کے بعد انہوں نے کہا کہ دیکھو، قرآن کہتا ہے کہ ماں کا سب، قرآن میں کہیں نہیں لکھا ہوا ہے کہ بیٹے کا سب۔ اتنے کھلے اعلان سے تم لوگ بغاوت کر رہے ہو۔ جب اللہ نے کہہ دیا کہ ماں کا سب۔ تو تم نے کہاں سے نکال لیا کہ بیٹے کا سب۔ یہ تو بغاوت ہے۔ اب تم لوگ توبہ کرو اور قرآن کے لکھے کے مطابق سب کا سب ماں کو دے دو۔

پیر صاحب کی اس پر اثر تقریر کے بعد وہ آدمی کھڑا ہو گیا جس نے ماں کو جائداد سے محروم کیا تھا۔ اور ہاتھ جوڑ کر اعلان کیا کہ میں اپنی غلطی کو مانتا ہوں اور پیر صاحب جس طرح کہہ رہے ہیں اسی طرح آج سے اس پر عمل کروں گا۔

جناب سید احمد صاحب (۶۶ سال) کے یہاں ۶ نومبر کی صبح کا ناشتہ تھا۔ میں وہاں پہنچا تو انہوں نے بہت محبت کے انداز میں کہا کہ حضور، سادہ روٹی لیں گے یا پوڑی۔ میں نے کہا کہ یہ مجھ سے پوچھنے کی بات نہیں آپ جو لائیں وہی کھالوں گا۔

جناب سید احمد صاحب (بگہا) نے کہا کہ میں بہت دنوں سے سنتا تھا کہ بہار اور بنگال میں پہلے ایسا

بولے مگر مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ تقریباً تیس آدمی کی اس مجلس میں انہی کی آواز سب سے زیادہ بلند ہے۔ ان کی مخلصانہ شخصیت اپنے آپ ایک خطاب تھی، خواہ انہوں نے اپنی زبان سے ایک لفظ بھی نہ کہا ہو۔

میں نے حضرت سجادہ نشین سے گذارش کی کہ آپ چند لفظوں میں ہم سب کے لئے کچھ نصیحت کے کلمے بتائیں، اس سلسلہ میں انہوں نے ایک واقعہ بتایا کہ سحبان الہند مولانا احمد سعید صاحب یہاں تشریف لائے۔ ان کو مرغ کا بہت شوق تھا، دستر خوان پر مرغ کا سالن پیش کیا گیا۔ انہوں نے گوشت کا ایک ٹکڑا منھ میں ڈالنے کے بعد کہا، کیوں حافظ محمد ثانی صاحب! یہ مرغ کس روغن میں پکایا گیا ہے۔ انہوں نے جواب دیا کہ تلخ، مولانا احمد سعید صاحب نے کہا استغفر اللہ مرغ کہیں روغن تلخ میں پکایا جاتا ہے۔ (روغن تلخ سے مراد سرسوں کا تیل ہے اور روغن شیریں سے مراد گھی)۔ اس کے بعد وہ دستر خوان سے اٹھ گئے اور مرغ کا گوشت نہیں کھایا۔ خانقاہ خیر آباد کے نائب سجادہ نشین مولانا فضل الرحمٰن ہارونی ہیں۔

مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے کہا کہ میرے والد مولانا ہارون نقشبندی کہا کرتے تھے کہ جو شخص اپنا کام کسی کی برائی سے شروع کرتا ہے تو اس میں شر چھپا ہوتا ہے اور جو شخص اپنا کام کسی کی خیر سے شروع کرتا ہے تو اس میں خیر کا پہلو ہوتا ہے۔ مزید وہ فرماتے تھے کہ تم اپنے آپ کو ایک پھلدار درخت کی طرح بنالو۔ جب کوئی اس پر ڈھیلہ پھینکتا ہے تو چوٹ کھا کر کے بھی وہ اس کو پھل دیتا ہے۔ تم اگر کسی کو ایک پھل نہ دے سکو تو اس کو دعا ہی دے دو۔

خانقاہ ہارونیہ خیر آباد کے آس پاس ہر مذہب کے لوگ آباد ہیں۔ یہاں عیسائی بھی ہیں، ہندو بھی ہیں اور مسلمان بھی۔ مگر سب کے سب امن و محبت کے ساتھ رہتے ہیں۔ اس علاقہ میں زیادہ تر ہندو لوگ ہیں۔ مسلمانوں کی تعداد بہت تھوڑی ہے مگر اس علاقہ کی اخلاقی قیادت مولانا حفظ الرحمٰن ہارونی کو حاصل ہے۔

جناب سید الاسلام صاحب (۵۲ سال) کلکتہ سے آکر ہمارے پروگرام میں شریک ہوئے۔ خانقاہ خیر آباد سے نکل کر جب آگے کے لئے روانگی ہوئی تو جناب سید الاسلام صاحب بھی میرے ساتھ تھے۔ انہوں نے یہاں کا ماحول دیکھنے کے بعد کہا۔ دیکھئے، یہاں ہندو اور مسلمان کا کوئی فرق نہیں۔ دونوں پیار اور شانتی کے ساتھ مل کر رہتے ہیں۔ مگر ایسی باتیں اخبار میں نہیں چھپتیں۔ اخبار والے ڈھونڈھ کر صرف جھگڑے والی باتیں لاتے ہیں اور انہیں کو چھاپتے ہیں۔ خانقاہ خیر آباد سے نکل کر جب باہر آئے تو ہماری گاڑی ایک مقام پر رکی۔ معلوم ہوا کہ یہاں اس علاقہ کے بلاک ڈولپ منٹ افسر رہتے ہیں۔ انہوں نے کہا تھا کہ مولانا جب

یہاں آئیں تو آپ مجھے ان کا درشن کرائیے۔ میں اپنی گاڑی پر بیٹھا ہوا تھا۔ ان کو میری موجودگی کے بارے میں بتایا گیا تو وہ کھانا چھوڑ کر فوراً سڑک پر آئے اور میری گاڑی کے پاس کھڑے ہوگئے۔ ان کے بدن پر اس وقت بنیائن تھی جس کے ساتھ جنیولٹک رہا تھا۔ اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ برہمن ہیں۔ میں نے کہا کہ مجھے خوشی ہے کہ اسی بہانے آپ سے ملنا ہوگیا۔ انہوں نے پرنام کرتے ہوئے کہا کہ خوشی تو مجھ کو ہے کہ آج آپ کے درشن کا اوسر پراپت ہوا جس کو میں بہت دن سے چاہتا تھا۔

جناب ماسٹر منظور احمد سبیا سے ملاقات ہوئی وہ بگہا کی تقریر میں شریک تھے اور مختلف مجلسوں میں بھی شریک رہے۔ انہوں نے اپنا تاثر بتاتے ہوئے کہا "مسلمانوں کے علاوہ ہندوؤں کو بھی آپ کی باتیں بہت پسند آتی ہیں۔ انہوں نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ آپ بار بار ہمارے بیچ میں آئیں اور اسی طرح کی باتیں سنائیں۔

میں نے کہا کہ ہندوؤں کی اس پسندیدگی کا سبب یہ ہے کہ دوسرے لوگ مسلمانوں کی بات کرتے ہیں اور میں اسلام کی بات کرتا ہوں۔ ہندوؤں کے سامنے مسلمانوں کی وکالت کی جائے تو ان کے اندر حریفانہ جذبہ جاگ اٹھتا ہے۔ جیسے مسلمانوں کے سامنے ہندوؤں کی وکالت کی جائے تو مسلمانوں کے اندر حریفانہ جذبات جاگ اٹھیں گے۔ لیکن جب میں اسلام کی بات کرتا ہوں تو وہ فطرت انسانی کی بات ہوتی ہے، اور کون ہے جو خود اپنی فطرت کا انکار کرے۔

مسٹر کشوری شاہ جو ہماری گاڑی چلا رہے تھے انہوں نے تقریروں اور باتوں کو سننے کے بعد بغیر پوچھے کہا کہ مولانا صاحب، آپ کی باتیں ہم کو بہت اچھی لگیں۔ ہمارا من بہت خوش ہوا ہم نے بہت دنیا دیکھی ہے اور بہت لوگوں کی باتیں سنی ہیں مگر آپ جیسا فقیر ہم نے پہلی بار دیکھا ہے۔

جناب محمد مقبول حسن صاحب (۵۰ سال) سبیا دیوراج نے اپنا تاثر بتاتے ہوئے کہا کہ آپ کی تقریر کی یہ صفت میں نے دیکھی کہ اس کو سن کر مسلمان بھی خوش ہوئے اور ہندو بھی خوش ہوئے۔ اور ہر ایک کی خواہش تھی کہ آپ یہاں بار بار آئیں اور ہم کو بار بار اسی طرح محبت اور انسانیت کی بات بتائیں۔ میرے دل میں آتا ہے کہ ایسی ہستی مجھ کو نہیں دکھائی دی تھی۔ انہوں نے کہا کہ دل چاہتا ہے کہ بس آپ ہی کے ساتھ رہوں۔ حضرت کی بات ایسی لگتی ہے کہ حضرت کی بات بار بار سنتے رہیں۔ حضرت کی ایک ایک بات غیبی ندا جیسی لگتی ہے۔ یہ کہتے ہوئے ان کی آنکھوں میں بے اختیار آنسو آگئے۔

مولانا محمد ثناء اللہ ندوی جو پورے سفر میں میرے ساتھ رہے ان سے میں نے پوچھا کہ پہلے آپ

نے صرف تحریروں کو پڑھا تھا اب آپ نے میرے روز و شب کو دیکھا اور براہ راست طور پر میری زبان سے میری باتوں کو سنا۔ پڑھنے اور دیکھنے میں آپ نے کیا فرق پایا۔

انہوں نے جو تاثر بیان کیا اس کے الفاظ یہ تھے۔ "میں نے آپ کی بہت سی کتابیں پڑھی ہیں۔ ان کتابوں میں جو پیغام ہے، انسانیت کی فلاح کے لئے جو درد جھلکتا ہے، اپنے وطن اور اہل وطن کے لئے جو محبت ہے، آپس میں اتحاد و اتفاق کا جو سندیش ہے، ان تمام چیزوں کا مکمل عملی نمونہ آپ میں پایا۔ اخلاق و عمدہ برتاؤ کا حقیقی روپ آپ کے اندر دیکھنے کو ملا۔ اخلاص کو انتہائی حد تک موجود پایا۔ وقت کی پابندی، اپنے ہم سفر ساتھیوں کی سہولت کا خیال، ہر ایک کے لئے خیر خواہی کا جذبہ، مخلوقات خدا سے بے حد محبت، مناظر فطرت کے شیدائی، علم دوست، انسانیت کے خیر خواہ، احکامات خداوندی کے بہت پابند، سنت رسول پر زندگی گزارنے والا، صبر و شکر کا حقیقی پیکر، انسانوں میں گھل مل کر رہنا، ہر آدمی سے قریب ہونے اور ہر ایک کو قریب رکھنے کی خصلت، قول و عمل میں مکمل مطابقت رکھنے والا پایا۔ الغرض ظاہر و باطن میں، قول و عمل میں پورے سفر کے اندر زندگی کے کسی گوشہ میں فرق اور تضاد نہیں پایا۔ خلاصہ یہ ہے کہ ایک مومن کی جو صفات ہیں ان کو آپ کے اندر بدرجہ اتم دیکھا۔"

مولانا عبد الرحیم امدادی (۴۶ سال) عجیب و غریب شخصیت کے آدمی ہیں۔ مادیات سے بے پرواہ، بے غرضی کی زندہ تصویر، اپنے حلیہ کے اعتبار سے قلندر، اپنے مزاج کی بنا پر میں اکثر ان کو سخت و سست کہہ دیتا تھا مگر وہ ہمیشہ مخلصانہ مسکراہٹ کے ساتھ اس کا جواب دیتے تھے۔ ایک مجلس میں ان کے بارے میں اپنا تاثر بتاتے ہوئے میں نے کہا کہ میرے تجربہ کے مطابق، وہ اس حدیث کی ایک زندہ تصویر ہیں جس میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: رُبَّ اشعثَ اَغبرَ مَدفوعٍ بالابواب لو اقسم علی اللہ لابَرَّہ۔ یعنی بہت سے بکھرے بال والے اور گرد آلود اور جن پر دروازے بند ہیں، اگر وہ اللہ پر قسم کھالیں تو اللہ ان کی قسم پوری کرے گا۔

۶ نومبر کو ہم لوگ بگہا سے نرکٹیا گنج جا رہے تھے۔ پورا سفر سرسبز درختوں کے ماحول میں گذر رہا تھا لیکن سڑک اتنی زیادہ خراب تھی کہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہم کار پر سفر نہیں کر رہے ہیں بلکہ ٹریکٹر پر سفر کر رہے ہیں۔ خراب سڑک اچھی کار کو ٹریکٹر جیسا بنا دیتی ہے۔ یہ دنیا کا نظام ہے۔

ایک صاحب نے کہا کہ حضرت، میرے لئے دعا کر دیجئے۔ میں ایک کتاب لکھنا چاہتا ہوں۔ اس کتاب کا نام ہوگا: امت مسلمہ نے قائدین کو کیا دیا۔ میں نے کہا کہ یہ تو ادھوری کتاب ہے۔ آپ کو یہ بھی

لکھنا چاہئے کہ قائدین نے امت مسلمہ کو کیا دیا۔ پھر میں نے کہا کہ میرے مطالعہ کے مطابق، قائدین نے امت مسلمہ کو بے شعوری دی، اور امت مسلمہ نے قائدین کو بھیڑ لوٹائی۔ قائدین نے امت مسلمہ کو جذباتیت دی، امت مسلمہ نے قائدین کو زندہ باد کے نعرے دئے۔ قائدین نے امت مسلمہ کو پرجوش بیانات دئے، اور امت مسلمہ نے قائدین کو چندوں کا خزانہ دیا۔ قائدین نے امت مسلمہ کو لفظی خطابت اور انشاپردازی دی، اور امت مسلمہ نے قائدین کو شاندار اسٹیج فراہم کیا۔ قائدین نے امت مسلمہ کو مخلصانہ نادانی دی اور امت مسلمہ نے قربانی دے کر قائدین کا نام روشن کیا۔ خلاصہ یہ کہ قائدین نے امت مسلمہ کو کچھ بھی نہیں دیا اور امت مسلمہ نے قائدین کو اپنا سب کچھ دے دیا۔ میں نے جب یہ بات کہی تو مولانا عبد الرحیم امدادی نے اس پر اعتراض کرتے ہوئے کہا کہ حضرت آپ نے تو خود ہی دینی مدارس الرسالہ ستمبر ۲۰۰۰ میں کہا ہے کہ علماء ہند نے مدارس کی صورت میں بہت بڑا کام کیا ہے، پھر کیا آپ کی ان دونوں باتوں میں تضاد نہیں۔

میں نے کہا کہ میں نے اس وقت جو بات کہی اس کا تعلق سیاسی قائدین سے ہے۔ مدارس کا کام بلاشبہ ایک عظیم کام ہے۔ مگر وہ تمام تر غیر سیاسی علماء نے انجام دیا ہے۔ نرکٹیا گنج میں داخل ہونے کے بعد پہلا پروگرام آدرش ودیالیہ میں ہوا۔ یہاں طلبا واساتذہ نیز شہر کے کچھ اور لوگ موجود تھے۔ نرکٹیا گنج میں جناب عبد الجبار صاحب ہیڈ ماسٹر آدرش ودیالیہ سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے کہا کہ میں بیالیس سال سے آپ کی تحریریں پڑھ رہا ہوں۔ اس نے میری زندگی میں ایک انقلاب برپا کر دیا ہے۔ اس کے ذریعہ مجھے خدائے واحد کی معرفت اور دین کا صحیح شعور حاصل ہوا ہے۔ میں نے آپ کی تقریباً سب کتابیں پڑھی ہیں۔ میں اللہ کے فضل سے ہمیشہ سے قرآن پر ایمان رکھتا تھا مگر "تذکیر القرآن" پڑھ کر میں نے گویا قرآن کو پھر سے دریافت کیا۔

جناب گلریز اختر صاحب سے میں نے پوچھا کہ الرسالہ مشن کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں۔ انہوں نے کہا الرسالہ پڑھ کر یہ فخر ہوتا ہے کہ ہمارے اندر آپ جیسا ایک فقیر بھی ہے جو اسلام کا پیغام ساری قوموں کو یکساں طور پر پہنچا رہا ہے۔ اور لوگ اس کی بات سن رہے ہیں۔ یہ مشن اگر پوری طرح پھیل جائے تو وہ وقت آئے گا جب کہ ہندستان میں ہندو اور مسلمان والی سوچ ختم ہو جائے اور ملک کے تمام لوگ پیار ومحبت کے ساتھ مل جل کر رہنے لگیں۔

۹ نومبر کی سہ پہر کو گلریز اختر صاحب کی رہائش گاہ پر پریس کانفرنس ہوئی۔ تقریباً ایک درجن

اخباروں کے نمائندے موجود تھے۔ انہوں نے مختلف قسم کے ملکی و ملی سوالات کئے جن کا میں نے جواب دیا۔ ایک سوال کے جواب میں میں نے کہا کہ ملکی حالات کے بارے میں آپ لوگ اوپری احوال کو دیکھتے ہیں اور گہرائی میں جو اسباب کام کر رہے ہیں ان کو نہیں دیکھتے، اس لئے آپ لوگ ہمیشہ ملک کے بارے میں مایوسی کی باتیں کرتے ہیں جب کہ میں ہمیشہ ملک کے بارے میں امید کی بات کرتا ہوں۔

عام طور پر لوگ ملک کے بارے میں صرف اسی بات کو جانتے ہیں جو میڈیا میں آئے، میڈیا جو کہ صرف سلکٹیو خبروں کو لیتا ہے اس لئے میڈیا کسی ملک کی صحیح تصویر کے لئے کافی نہیں۔ ایک سوال کے جواب میں میں نے کہا کہ ملک کے نظام کا فیصلہ کسی پولیٹکل پارٹی کے دفتر میں نہیں کیا جاسکتا۔ یہ دراصل فطرت کے قوانین اور تاریخ کے عوامل ہیں جو کسی ملک یا قوم کی صورت گری کرتے ہیں۔

مولانا حافظ محمد ممتاز عالم مفتاحی سے نرکٹیا گنج میں ملاقات ہوئی۔ وہ الرسالہ کے قاری ہیں۔ ان سے میں نے ان کا تاثر پوچھا تو انہوں نے کہا کہ میں اس کو اتنا مفید سمجھتا ہوں کہ میں چاہتا ہوں کہ سارے ہی لوگ اس رسالہ کو پڑھیں۔ انہوں نے بتایا کہ الرسالہ کا شمارہ ستمبر ۲۰۰۰ "دینی مدارس" کو پڑھ کر میں اتنا متاثر ہوا کہ میں نے فیصلہ کیا کہ مجھے ایک مدرسہ چلانا ہے۔ میرے اقتصادی حالات زیادہ اچھے نہیں ہیں پھر بھی میں نے اپنی جیب سے ایک رقم نکالی اور ایک مدرسہ ابتدائی طور پر شروع کر دیا۔ میرا یقین ہے کہ انشاء اللہ یہ ایک کامیاب تعلیمی ادارہ بن کر رہے گا۔ میں جس گاؤں میں رہتا ہوں وہاں بہت کم پڑھے لکھے لوگ ہیں۔ اس لئے میں چاہتا ہوں کہ الرسالہ کو اتنا آگے بڑھاؤں کہ وہ پوری قوم کو تعلیم یافتہ بنانے کا ذریعہ بن جائے۔ ان کے گاؤں کا نام کھیر ٹیا بوریا (مغربی چمپارن) ہے۔

نرکٹیا گنج میں میں جناب گلریز اختر صاحب کے مکان پر تھا۔ ایک صاحب میرے کمرے میں داخل ہوئے اور کہا کہ میں دو گھنٹہ کی تلاش کے بعد یہاں پہنچا ہوں۔ سلام کے بعد انہوں نے مصافحہ کیا۔ انہوں نے میرا ہاتھ اتنی زور سے دبایا کہ دیر تک اس کا اثر محسوس ہوتا رہا۔ میں نے ان کو نصیحت کرتے ہوئے کہا کہ میرے بھائی! اللہ نے آپ کو سختی کی صلاحیت بھی دی ہے اور نرمی کی صلاحیت بھی۔ مگر ایمان کا تقاضہ یہ ہے کہ آپ اس معاملہ میں باشعور ہوں۔ اپنی صلاحیتوں کا بے سوچے سمجھے استعمال نہ کریں۔ آپ کو چاہئے کہ آپ دوسروں کو اپنی سختی کا تجربہ نہ کرائیں بلکہ اپنی نرمی کا تجربہ کرائیں۔

۶ نومبر کی شام کو انجمن اسلامیہ نرکٹیا گنج میں میری تقریر ہوئی۔ اس انجمن کے صدر ڈاکٹر محمد اکرام صاحب ہیں۔ اپنی تقریر میں میں نے علم کی اہمیت بتائی۔ اس پروگرام کے بارے میں جناب گلریز صاحب

ناظم اعلیٰ جامع مسجد نرکٹیا گنج نے اپنے تاثرات ان الفاظ میں بیان کئے: ہندو مسلم سکھ عیسائی سب کو مل کر رہنا ہے۔ پہلے نرکٹیا گنج کو بچاؤ، نرکٹیا گنج بچے گا تب مندر مسجد، ہندو مسلمان رہیں گے۔

۶ نومبر ۲۰۰۰ کو مغرب کے بعد نرکٹیا گنج میں عمومی جلسہ تھا۔ یہ ریلوے کالونی کے وسیع میدان میں تھا۔ بہت بڑی تعداد میں لوگ موجود تھے۔ لوگوں کا بیان ہے کہ اس میں تقریباً ساٹھ فیصد ہندو حضرات تھے جن میں بیشتر تعلیم یافتہ لوگ تھے۔ میں نے اپنی ایک گھنٹہ کی تقریر میں یہ بتانے کی کوشش کی کہ ملک کی تعمیر کے لئے ہمیں کیا کرنا چاہئے۔ میں نے کہا کہ آزادی کے بعد ضرورت تھی کہ ہندستان میں تعمیر افراد و تعمیر معاشرہ کا کام کیا جائے۔ مگر یہ کام نہ ہو سکا۔ مثلاً اس دوران میں جو تحریکیں اٹھیں، مسلمانوں اور ہندوؤں دونوں میں، وہ تقریباً سب کی سب حقوق کے لئے اٹھیں نہ کہ ڈیوٹی کے لئے۔ نتیجہ یہ ہے کہ آج ہمارا پورا معاشرہ حقوق شناس (right conscious) ہو گیا جب کہ کامیاب معاشرہ وہ ہے جو فرض شناس (duty conscious) ہو۔

میں نے کہا کہ رسول اللہؐ ایک بار دعا کر رہے تھے۔ دعا کے دوران آپ نے جن چیزوں سے پناہ مانگی ان میں ایک فقر تھا۔ حضرت عائشہ نے تعجب سے کہا کہ آپ فقر سے پناہ مانگ رہے ہیں۔ حضورؐ نے کہا ہاں اے عائشہ! فقر اور محتاجی آدمی کو بے دین بنا دیتی ہے: کاد الفقر أن یکون کفراً۔ یہ حدیث صرف ذاتی فقر کے لئے نہیں ہے بلکہ قومی فقر کے لئے بھی ہے۔ اس لئے ہمارا پہلا کام یہ ہے کہ ملک کو اقتصادی بدحالی سے نکال کر خوش حالی کے دور میں لائیں۔ ملک میں بہترین انفراسٹرکچر ہو، وغیرہ۔

مسز نوشابہ انجم پرنسپل سن رائز اکیڈمی بتیا نے اپنی ڈائری میں مجھ سے کوئی نصیحت لکھنے کے لئے کہا۔ میں نے ان کی ڈائری میں یہ الفاظ لکھ دئے: دوسروں کے مقابلہ میں بے شکایت ہو جانا اور اپنے عمل پر بھروسہ کرنا یہی دو چیزیں دنیا میں کامیابی کی یقینی ضمانت ہیں۔ اس سفر میں بہت سے لوگوں نے اپنی ڈائری پر نصیحت کے کلمات لکھوائے۔ کسی کی ڈائری پر میں نے لکھا کہ بولنے والا حقیقت میں وہ ہے جو اس سے پہلے سننے کے مرحلہ سے گزر چکا ہو۔

اسی طرح ایک اور صاحب کی ڈائری پر میں نے لکھا کہ سچا اقدام وہ ہے جو مستقبل کو دیکھ کر کیا جائے نہ کہ صرف حال کو دیکھ کر۔ اسی طرح ایک اور صاحب کی ڈائری میں میں نے لکھا کہ ڈگری کے ذریعہ سروس ملتی ہے اور علم کے ذریعہ زندگی کا شعور۔ اسی طرح ایک اور نوجوان کی ڈائری پر میں نے لکھا کہ نوجوانی کی عمر ہی کام کی عمر ہوتی ہے، مگر بیشتر لوگ اپنی عمر کے اس قیمتی حصہ کو ضائع کر دیتے ہیں۔ ایک اور صاحب کی ڈائری پر لکھا کہ بولنے سے پہلے سوچئے اور کرنے سے پہلے منصوبہ بنائیے۔

۶ نومبر کی شام کو حاجی ڈاکٹر محمد اکرام کے یہاں شام کا کھانا تھا۔ رات بھی انہیں کے یہاں گذاری۔
۷ نومبر کی صبح کو جب میں ڈاکٹر محمد اکرام صاحب نرکٹیاگنج کے مکان پر تھا تو میں نے دیکھا کہ گھر کے باہر کافی کہر پھیلا ہوا ہے۔ معلوم ہوا کہ ہمالیہ پہاڑ یہاں سے صرف ۴۰ کلو میٹر دور ہے۔ چنانچہ یہاں سردیوں کا موسم آتے ہی کہر شروع ہو جاتا ہے۔

۷ نومبر کی صبح کو فجر کی نماز کے بعد حاضرین سے مختصر گفتگو کی۔ میں نے کہا کہ دعوت کا عمل ایک نازک عمل ہے جس طرح تجارت کا عمل ایک نازک عمل ہوتا ہے۔ تجارت کے لئے پہلا کام یہ ہے کہ آدمی گاہکوں کے نزدیک اعتبار حاصل کرے۔ اگر وہ گاہکوں کی نظر میں ایک غیر معتبر آدمی بن جائے تو وہ اپنی تجارت کامیابی کے ساتھ نہیں چلا سکتا۔ اسی طرح داعی کی شخصیت اگر مدعو گروہ کی نظر میں غیر معتبر شخصیت بن جائے تو وہ اپنا دعوتی عمل موثر طور پر ان کے درمیان جاری نہیں کر سکتا۔

نرکٹیاگنج اور بتیا کے راستہ میں ایک معاملہ پیش آیا اس کے بعد میں نے مولانا عبدالرحیم امدادی سے کہا کہ آپ لوگ صرف ایک کام جانتے ہیں۔ کوئی عالم مل جائے تو اس کا سر اور پاؤں دبانا اس کے وضو کے لئے پانی رکھنا۔ جب وہ وضو کرے تو اس کے پیچھے تولیہ لے کر کھڑے رہنا، جب وہ بات کرے تو تسبیح لے کر اس کے دانہ پر انگلیاں پھراتے رہنا، وہ اٹھے تو اس کا ہاتھ پکڑ لینا، کہیں جانے لگے تو جلدی سے اس کا جوتا سیدھا کرنا اور یہ سب کر کے صرف یہ کہنا کہ حضرت میرے لئے دعا کیجئے اور پھر مطمئن ہو جانا کہ حضرت کی برکت سے دنیا و آخرت کے تمام معاملات درست ہو گئے۔

میں نے کہا کہ ہمارا مشن اس سے بالکل مختلف ہے۔ پوری امت ایک ایسے نقشہ کار کی عادی ہو گئی ہے جس میں سوچنے کے عمل کا کوئی خانہ ہی نہیں ہے یہ پورا عمل برکت کے تصور پر قائم ہے نہ کہ شعور پر۔ ہمیں اس نقشہ کو بدلنا ہے، ہمارا مشن امت کو باشعور بنانا ہے نہ کہ برکت کی پر اسرار گولیاں تقسیم کرنا۔

نرکٹیاگنج سے پٹنہ جاتے ہوئے ہم لوگ حسب ذیل مقام سے گذرے ——— نمی چوک، ساٹھی، چنپٹیا، کمار باغ، بتیا، چھپوا، موتی ہاری، چکیا، مہسی، موتی پور، کانٹی، مظفر پور، رام دیالو، ترکی، گردل، بھگوان پور، سرائے حاجی پور، گنگا پل، گاندھی پل، پٹنہ، وغیرہ۔

قاری محمد ظفیر عالم صاحب (۴۵ سال) بھی اس سفر میں ہم لوگوں کے ساتھ تھے وہ نیپال میں پورنیا کے قریب رہتے ہیں۔ یہاں مدرسہ حسینیہ ہے جو ۱۹۱۴ میں قائم کیا گیا۔ قاری محمد ظفیر عالم اس کے صدر مدرس ہیں۔ اس مدرسہ میں چار سو طلبہ ہیں۔ اساتذہ کی تعداد دس ہے۔ اس مدرسہ کی اپنی عمارت ہے۔ اس

کے احاطہ میں ایک باقاعدہ مسجد بھی ہے۔ یہ اس علاقہ کا سب سے بڑا مدرسہ ہے۔ اور اسی طرح ترائی کے علاقہ میں ایک اور بہت بڑا مدرسہ محمودیہ راجپور گنگو، نیپال ہے جو ندوۃ العلماء کی شاخ ہے۔

وہ الرسالہ کے مستقل قاری ہیں۔ انہوں نے اپنے تاثرات بتاتے ہوئے کہا: الرسالہ میں دین ودنیا کی حکمت بتائی جاتی ہے۔ الرسالہ کا پیغام یہ ہے کہ تھوڑا نقصان برداشت کرلو تاکہ تم زیادہ فائدہ حاصل کر سکو۔ انہوں نے کہا کہ خوش اخلاقی ایک طاقت ہے، آدمی کے اندر اگر خوش اخلاقی ہو تو وہ اس کے ذریعہ بڑے بڑے کارنامے انجام دے سکتا ہے۔

شری سبودھ کمار سنگھ (۲۸ سال) سے بتیا میں ملاقات ہوئی، ان سے میں نے پوچھا کہ آپ کیا کرتے ہیں انہوں نے کہا کہ پڑھ لکھ کر بے روزگار ہوں۔ انہوں نے الرسالہ ہندی کے شمارے پڑھے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ اس کی باتیں بہت زیادہ دل کو لگتی ہیں۔ میں نے کہا کہ آپ الرسالہ میں ایک بات پڑھنا بھول گئے۔ وہ یہ کہ آدمی باہر سے بے روزگار ہو سکتا ہے مگر من سے کوئی آدمی بے روزگار نہیں۔ انہوں نے بتایا کہ وہ چار سال سے بے روزگار ہیں۔ میں نے کہا کہ میں تو اپنی ساری عمر ہی بے روزگار رہا ہوں۔ مگر میں نے اپنے آپ کو ایک دن بھی بے روزگار نہیں سمجھا۔ ایک روزگار وہ ہے جو دفتروں میں دیا جاتا ہے دوسرا روزگار وہ ہے جو آدمی خود اپنے آپ بناتا ہے۔

پھر میں نے کہا کہ دیکھئے میں ایک ہفتہ سے بہار کی یاترا کر رہا ہوں، دیکھنے والوں کے لئے یہ ایک باہر یاترا ہو سکتی ہے مگر میرے لئے وہ ایک بھیتر یاترا ہے۔ میں یہ سفر دوسروں کو کچھ دینے کے لئے نہیں کر رہا ہوں بلکہ دوسروں سے کچھ لینے کے لئے کر رہا ہوں۔ میرے لئے چڑیوں کی آوازیں ٹیچر کا کام کرتی ہیں۔ میرے لئے پیڑ کی پتیاں کتاب فطرت کے اوراق ہیں، حتیٰ کہ بہار کی ٹوٹی سڑکیں بھی مجھ کو انسانی عجز کی یاد دلاتی ہیں۔ انہوں نے کہا کہ الرسالہ 'ہندی' کو دیکھنے کے بعد میں نے طے کیا ہے کہ اس کو برابر پڑھوں گا۔ میں نے پوچھا کہ آپ کو اس میں کیا ملا، انہوں نے کہا کہ اس میں مانویہ سچائی (मानवीय सच्चाई) ملی۔ الرسالہ میں جو چیز ہم کو ملی وہ کہیں اور سے نہیں ملی۔

راستہ میں منشاء ٹولہ سے گزرے جہاں سڑک کے کنارے جناب نعیم اختر صاحب کا مکان ہے۔ ان کے اصرار کے تحت ہمارے قافلہ نے ان کے گھر پر چائے پی اور کچھ سوالوں پر گفتگو ہوئی۔ جناب نعیم اختر صاحب نے کہا کہ آپ علامہ اقبال پر تنقید کرتے ہیں، یہ ٹھیک نہیں ہے۔ علامہ اقبال کا زمانہ وہ تھا جب کہ مسلمان سیاسی محرومی کا شکار ہوئے جس کے نتیجہ میں ان کے اندر مایوسی پیدا ہوئی۔ لوگوں کے اندر شکست

خوردہ ذہنیت پیدا ہو گئی۔ اس وقت اقبال نے مسلمانوں کو جوش دلا کر ابھارا۔ ان کے ولولہ انگیز کلام نے مسلمانوں کے اندر ناکامی کا احساس ختم کیا۔ یہ ایک کارنامہ ہے جس کا آپ کو اعتراف کرنا چاہئے۔ میں نے کہا کہ محرومی کے زمانہ میں محرومی کے سبب کو بتانے کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ سبب کو دور کر کے حالات کو بدلا جائے۔ ایسے موقع پر پرجوش خوراک تو گویا الٹی خوراک ہے جو محرومی پر غفلت کے اضافہ کے ہم معنی ہے۔

پٹنہ کے لئے جاتے ہوئے راستہ میں ہم لوگ موتی ہاری سے گزرے۔ یہاں شہر کی ممتاز شخصیت ڈاکٹر عزیز الرحمٰن صاحب کے گھر پر تھوڑی دیر کے لئے ٹھہرے، یہاں ظہر کی نماز پڑھی گئی۔ ڈاکٹر صاحب اس وقت اپنے مطب میں تھے۔ انہوں نے سنا تو مطب چھوڑ کر فوراً آ گئے۔ وہ ہم لوگوں کے کھانے کا انتظام کرنا چاہتے تھے۔ پچھلی بار جب میں یہاں آیا تھا تو انہوں نے اہتمام کے ساتھ ہم لوگوں کے لئے کھانا تیار کر لیا تھا۔ میں نے ان سے کہا کہ آپ ہمیں دعوتی کھانا ہرگز نہ کھلائیے۔ میرا پسندیدہ کھانا وہ ہے جو کسی تیاری کے بغیر بروقت گھر کے اندر موجود ہو۔ آپ لوگ کھانا کھا چکے ہیں۔ اب آپ صرف یہ کریں کہ جو چیز بھی بچی ہوئی موجود ہے بس وہی ہمیں دے دیں۔

ڈاکٹر صاحب نہایت صالح اور سنجیدہ آدمی ہیں۔ انہوں نے میری بات مان لی۔ گھر کے اندر جا کر بچی ہوئی روٹی اور بچا ہوا سبزی کا سالن لے آئے۔ یہ میری عین پسند کا کھانا تھا۔ بچی ہوئی چیز کے استعمال سے میری روح کو خصوصی خوشی حاصل ہوتی ہے۔ میں نے سالن کے ساتھ دو روٹی کھائی اور ایک گلاس پانی پیا اور جذبۂ شکر کے ساتھ ڈاکٹر صاحب سے رخصت ہو کر آگے کے لئے روانہ ہو گیا۔

ہم لوگ پٹنہ پہنچے تو شام کے چھ بج چکے تھے، ایم ٹی خان صاحب کی رہائش گاہ پر بہت سے لوگ آ گئے۔ ان سے دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔

پٹنہ میں چند گھنٹہ قیام کے بعد ریلوے اسٹیشن کے لئے روانگی ہوئی۔ پٹنہ سے مجھے راجدھانی اکسپریس کے ذریعہ دہلی آنا تھا۔ ٹرین ٹھیک وقت پر پٹنہ سے دہلی کے لئے روانہ ہوئی اور ٹھیک وقت پر پہنچ گئی۔ یہ پورا سفر رات میں طے ہوا۔ بیشتر وقت سوتے ہوئے گزرا۔ ۷ نومبر کی صبح کو میں دہلی واپس آ گیا۔

واپسی کے بعد بہار سے بہت سے خطوط اور ٹیلی فون موصول ہوئے۔ ہر ایک میں دورہ کے بارے میں غیر معمولی تاثرات کا اظہار تھا۔ بتیا سے جناب سید عبد المجید صاحب نے ۱۴ نومبر ۲۰۰۰ کو ٹیلی فون پر بتایا کہ وہاں میری جو تقریر ہوئی تھی اس کو انہوں نے مکمل طور پر ٹیپ کر لیا تھا اور اب اس کا کیسٹ تیار کر

کے وہ اس تقریر کو لوگوں میں پھیلا رہے ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ کیسٹ میں آپ کی آواز بہت صاف اور واضح ہے۔ انہوں نے کہا کہ بہار میں آپ کی تقریر کا کیسٹ بذات خود آپ کے خلاف بے بنیاد پروپیگنڈوں کی کاٹ کے لئے بالکل کافی ہے۔ سفر سے واپسی کے بعد بہار سے جو مختلف خطوط موصول ہوئے، ان میں سے صرف ایک خط یہاں نقل کیا جاتا ہے:

محترم جناب مولانا وحید الدین خاں صاحب السلام علیکم ورحمۃ اللہ

عرض یہ کہ ڈھاکہ (مشرقی چمپارن) میں آپ کی تشریف آوری سے الرسالہ کا پیغام جو پہلے زیادہ تر خواص میں تھا وہ اب عوام میں پھیل گیا ہے۔ آپ کا چرچا ہر طرف موضوع بحث بنا ہوا ہے۔ جو لوگ پہلے آپ کو نہیں جانتے تھے وہ بھی اب آپ کو جاننے لگے ہیں۔ ۴ نومبر کو کچھ افراد میرے پاس آئے اور الرسالہ مشن کے بارے میں تفصیل سے جانکاری لی۔ انہوں نے ہر ماہ الرسالہ پڑھنے کا پختہ ارادہ کیا۔ اب لوگ الرسالہ پڑھنے والے نوجوانوں کی ایک کمیٹی بنانے اور گاؤں گاؤں میں الرسالہ کو پھیلانے کی بات کرنے لگے ہیں۔ یہاں مختلف موضوعات پر آپ کے جو خطابات ہوئے، اس کے غیر معمولی اثرات ظاہر ہوئے ہیں۔ یہ اللہ کا خصوصی فضل ہے۔

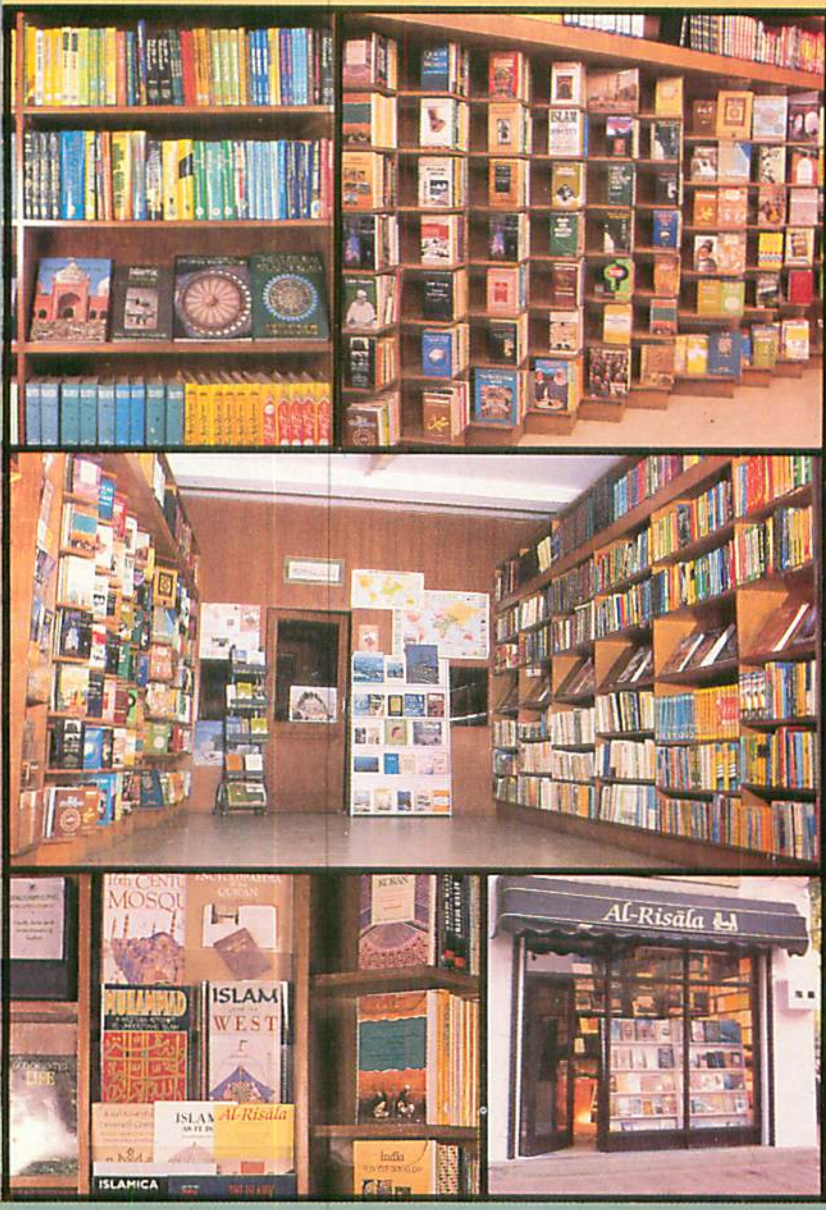
الرسالہ کا ذوق یہاں کے لوگوں میں بہت بڑھا ہوا ہے۔ آپ کے دورہ کے بعد میرے حوصلوں میں بھی کافی اضافہ ہو گیا ہے۔ قوی امید ہے کہ قارئینِ الرسالہ کے حلقہ کے ذریعہ، جن میں ڈھاکہ کی مشہور شخصیت عطاء اللہ ڈھاکوی اور دیگر باشعور افراد شامل ہیں، انشاء اللہ اب کافی کام ہونے لگے گا۔

محمد نسیم (۲۹ سال) ڈھاکہ

Books by Maulana Wahiduddin Khan

Islam Rediscovered	195.00
A Treasury of the Quran	75.00
The Quran for All Humanity	75.00
The Quran: An Abiding Wonder	145.00
The Call of the Qur'an	95.00
Muhammad: A Prophet for All Humanity	195.00
Words of the Prophet Muhammad	75.00
An Islamic Treasury of Virtues	195.00
Islam and Peace	150.00
Introducing Islam	195.00
The Moral Vision	145.00
Principles of Islam	145.00
Indian Muslims	65.00
God Arises	125.00
Islam: The Voice of Human Nature	40.00
Islam: Creator of the Modern Age	70.00
Woman Between Islam and Western Society	145.00
Woman in Islamic Shari'ah	125.00
Islam As It Is	70.00
Religion and Science	45.00
Tabligh Movement	40.00
Hijab in Islam	20.00
The Way to Find God	25.00
The Teachings of Islam	50.00
The Good Life	45.00
The Garden of Paradise	45.00
The Fire of Hell	45.00
Islam and the Modern Man	25.00
Uniform Civil Code	20.00
Man Know Thyself	20.00
Muhammad: The Ideal Character	20.00
Polygamy and Islam	20.00
Concerning Divorce	20.00

Finest collection of books on Islam



RNI 28822/76 • U(SE) 12/2001
Delhi Postal Regd. No. DL/11154/2001

AL-RISALA BOOK CENTRE

1, Nizamuddin West Market, New Delhi 110 013, Tel. 462 6666, 462 5454, 461 1128
Fax 9111-469 7333, 464 7980.e-mail: skhan@vsnl.com